بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:7 جولائی 2015

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya @ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com
'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں
شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر اعلیٰ	4
عید الفطر	نظم: عید کی خوشی	نظیر اکبرآبادی	5
	نظم: عید قوّالی	اسد رضا	6
کہا نیاں	ایمنا میمنا	مرزا حامد بیگ	7
	نانا کی چھتری	محمد داؤد	9
غیر ملکی کہانیاں	اڑنے والی لومڑی	لیو ٹالسٹائی	11
		مترجم: محمد یوسف انصاری	
	برما کی لوک کہانی، چار کٹھ پتلے	نصر ملک	16
سچّی کہانی	انسان اور کائنات	ادریس صدیقی	20
سائنس کی الف لیلہ	قصہ ایک عظیم سائنس داں کا	سکٹف اور سکٹف	23
مضمون	ٹیلی فون کا سفر	راشد جمال فاروقی	28

مضمون	جنگل میں مور ناچا، کوئل نے...	محمد قیوم میو	33
	جگنو کی روشنی	عظیم اقبال	38
نانی کا صندوق	نظم: بچّہ اور جگنو	اسماعیل میرٹھی	40
کامکس کہانی	علی بابا اور چالیس چور	ادارہ	41
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	47
ننھے فنکار	بچّوں کی تخلیقات	ادارہ	51
قسط وار ناول	الٹا درخت۔2	کرشن چندر	53
یہ ہندوستان ہے پیارے	انوکھے منظر: ہمارے تہوار	ادارہ	62

آپس کی باتیں

عبادتوں، برکتوں اور نعمتوں کا مقدس مہینہ اب جا رہا ہے اور عید کا وہ دن آنے کو ہے جس کا بچّے خاص طور سے سال بھر انتظار کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ رمضان بھوک اور پیاس کی سختیاں جھیلنے اور صبر وضبط اور ڈسپلن کی تربیت کا مہینہ ہے۔ اور اس مرتبہ تو یہ مہینہ سخت ترین گرمیوں کے دنوں میں آیا ہے۔ اس کے باوجود جمعۃ الوداع کے بعد رمضان کے رخصت ہو جانے کے خیال سے جی اداس سا ہونے لگتا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ عید کے بعد نہ سحری ہوگی نہ افطار۔ نہ بازاروں میں پھلوں اور مٹھائیوں سے سجی ہوئی دکانوں کی وہ رونق دکھائی دے گی۔ نہ گھروں پر کوئی سحری کے لیے جگانے آئے گا۔ نہ گھروں میں افطاری کے دسترخوان سجیں گے۔ جو لوگ پابندی سے روزے رکھتے ہیں انھیں دن میں بھوکا پیاسا رہنے کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ عید کے بعد کئی روز تک دن میں کچھ بھی کھانے پینے سے پہلے چند لمحوں کے لیے ٹھٹھک جاتے ہیں اور تب دھیان آتا کہ ارے، رمضان تو جا چکے ہیں۔ ہمیں اپنے بچپن کے رمضان یاد ہیں، اور والدین سے بھی سنا ہے کہ اس مہینے سے لوگوں کو کس قدر محبت ہو جاتی تھی۔ اور کیوں نہ ہو، رمضان صرف عبادت وریاضت کا مہینہ نہیں بلکہ ہماری تہذیب اور ہمارے کلچر کا بھی حصہ ہے۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے مہینے بھر کے انتیس یا تیس دن تک یہ ہماری زندگی کا حصہ بن کر ساتھ رہتا ہے۔ ایسا مہمان جب رخصت ہوگا تو دل کیوں نہ بھر آئے گا؟ اُن دنوں رمضان کے آخری ایّام میں میلا دخوانوں کی ٹولیاں سحری کے وقت روزہ داروں کو جگانے کے لیے 'الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع' گاتی ہوئی سڑکوں سے گزرا کرتی تھیں۔ غم میں ڈوبی ہوئی ان آوازوں کا دلوں پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ لوگ اس مہینے کا آج بھی اس قدر احترام کرتے ہیں کہ عام بول چال میں اسے صرف رمضان نہیں بلکہ 'رمضان شریف' کہا جاتا ہے۔ یوں تو اب وقت بدل گیا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے رویّے اور طور طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ لیکن رمضان کے مہینے سے محبت اور اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ مسلمانوں کی بستیوں میں آج بھی رمضان میں لوگ دن کے وقت کھلے عام کچھ کھانے پینے سے بچتے ہیں۔ دفتروں میں ہندو اور دوسرے مذہبوں کے لوگ آج بھی روزہ دار مسلمانوں کو عزت دیتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے سامنے پانی پینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

اسلامی عقیدے کے مطابق رمضان کے بعد عید الفطر کا دن اللہ میاں کی طرف سے مسلمانوں کو گویا ایک مہینے کی سختیاں برداشت کرنے کا انعام ہے۔ یہاں تک کہ اس دن روزہ رکھنے سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمان اس انعام کو خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ اس روز نئے اور عمدہ کپڑے پہنے جاتے ہیں، لذیذ کھانے تیار ہوتے ہیں۔ سویّاں اور شیر خورما، یعنی چھوہارے اور دودھ سے بننے والی شیر تو ہمارے ملک میں عید الفطر کا وہ لازمی پکوان ہے کہ عام لوگوں نے اسے 'میٹھی عید' یا 'سویّوں والی عید' کے نام دے ڈالے ہیں۔ ظاہر ہے بچّے اس عید پر سب سے زیادہ خوش نظر آتے ہیں۔ جس کی ایک خاص وجہ، نئے کپڑوں اور جوتوں کے علاوہ، وہ 'عیدی' ہے جو بڑوں اور بزرگوں سے انھیں تحفوں اور نقدی کی صورت میں ملتی ہے۔ تو بھئی آپ سب اس مرتبہ بھی خوب مزے سے عید منائیے۔ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر انھیں سلام کیجیے، ان سے عیدی لیجیے، دوستوں سے ملیے، لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیے۔ ویسے تو بچّے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے پھر بھی کہیں کہیں کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ اس لیے جن دوستوں سے آپ کی ناراضی یا 'کٹّی' چل رہی ہے، انھیں عید پر مت بھول جائیے، کیونکہ یہ صرف خوشی کا نہیں میل ملاپ کا بھی دن ہے۔ یہ انتظار کیے بغیر کہ ناراض ہونے والے آپ سے ملنے آئیں خود ہی ان کے گھر شیر یا مٹھائی لے کر جائیے اور خود بڑھ کر انھیں گلے لگا لیجیے۔ یقین کیجیے، عید کی خوشیاں دوگنی ہو جائیں گی۔

آپ سبھی کو 'بچّوں کی دنیا' کی پوری ٹیم کی طرف سے عید کی بہت بہت مبارک باد!

ادارہ

نظیر اکبرآبادی

عید کی خوشی

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو زُہد کی تمہید کی خوشی
ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزے کی خشکیوں سے جو ہیں زرد زرد گال
خوش ہوگئے وہ دیکھتے ہی عید کا ہلال
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید لال
دل کیا کہ ہنس رہا ہے پُرا تن کا بال بال

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

پچھلے پہر سے اٹھ کے نہانے کی دھوم ہے
شیر و شکر سویّاں پکانے کی دھوم ہے
پیرو جواں کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے
لڑکوں کو عید گاہ میں جانے کی دھوم ہے

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزے کی سختیوں میں نہ ہوتے اگر اسیر
تو ایسی عید کی نہ خوشی ہوتی دل پذیر
سب شاد ہیں گدا سے لگا شاہ تا وزیر
دیکھا جو ہم نے خوب تو سچ ہے میاں نظیر

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

نظیر اکبرآبادی

پیدائش 1735 وفات 1830

عابد: عبادت کرنے والا
طاعت: حکم پر چلنا
تجرید: پاک رہنا
زاہد: پرہیزگار، زُہد: پرہیز کرنا
تمہید: شروعات
پیر: بزرگ

اسد رضا

عید قوّالی

کتنی خوشیوں کو ساتھ لائی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے
تیس روزوں کے بعد شام آخر
عید کا چاند لے کے آئی ہے
بچّے اور ابّو عید گاہ میں ہیں
جس میں ہر سو بہار چھائی ہے
واہ کیا تھا مزہ سویّوں میں
کھیر بھی ہم نے خوب کھائی ہے
بولے حامد سے یہ میاں موہن
شیر کیا یہ تو رس ملائی ہے
عید میلے میں خوب آیا مزا
سب نے اپنی دکاں سجائی ہے
نتھو حلوائی کی دکان میں تو
جیسے دنیا کی ہر مٹھائی ہے
عید کے دن گلی میں بچّوں نے
کیا دھما چوکڑی مچائی ہے
عیدی لے کر اسد سے بچّوں نے
آج قوّالی جم کے گائی ہے

عید آئی ہے عید آئی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے

Asad Raza F 97 Sector 7 DDA Flats Jasola New Delhi -110025

کہانی

□ مرزا حامد بیگ

ایمنا اور میمنا

بہت دنوں کی بات ہے، ایک بستی تھی اور بستی کے بازار کے بیچوں بیچ ایک بندریا سر منڈا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بھورے بال اس کے سامنے ننھی سی ٹوکری میں رکھے تھے اور وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

لوگ اپنے بچوں کو ساتھ لیے رنگ برنگے کپڑے اور موتی چور کے لڈو خرید رہے تھے۔ اس سے کسی نے نہ پوچھا کہ وہ یوں سر منڈائے کیوں بیٹھی ہے۔

کچھ دیر بعد گنّے سے لدی ایک بیل گاڑی دور سے آتی نظر آئی۔ لوگ راستہ چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ آتے آتے دونوں بیل اس بندریا کے سامنے آکر رک گئے۔ گاڑی بان نے انھیں بہت ہانکا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ گاڑی بان تھک ہار کر بیل گاڑی سے نیچے اترا اور سر جھکا کر بندریا کے پاس بیٹھ گیا۔ بندریا نے اسے دیکھ کر منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ گاڑی بان نے نہایت دھیمے لہجے میں پوچھا:

''کیوں بی بندریا! یوں سر منڈائے بازار کے بیچوں بیچ کیوں بیٹھی ہو؟''

بندریا نے جواب دیا ''تھوڑے سے گنّے دے جاؤ تو بتاؤں گی۔''

گاڑی بان نے ایک گٹھا گنّے اس کے سامنے ڈال دیے اور چلا گیا۔

بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ بیل گاڑی آئی، تو ایک بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ نزدیک آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس نے گھی کا کنستر اٹھا رکھا ہے۔ اس نے آتے ہی بندریا سے پوچھا:

''کیوں بی بندریا! کیا ہوا؟ یوں سر منڈائے بازار میں کیسے بیٹھی ہو؟''

بندریا بولی ''گھی کا کنستر رکھ جاؤ تو بتاؤں گی۔''

بڈھا گھی کا کنستر رکھ کر چلا گیا۔

اب چاول والا آیا اس نے ٹھیلے پر چاولوں

کی بوریاں اوپر تلے لادرکھی تھیں اور ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔اس نے قریب آکر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور وہی سوال کیا:

''کیوں بی بندریا! کیا ہوا؟ یوں سرمنڈائے بازار میں کیسے بیٹھی ہو؟''

بندریا نے سر جھکا کر کہا''چاولوں کی ایک بوری ڈال جاؤ تو بتاؤں گی۔'' ٹھیلے والے نے سنا اور وہ بھی چاولوں کی بوری رکھ کر چلا گیا۔

پھر سب نے دیکھا کہ ایک گُڑ والا آیا، اور سوال جواب کے بعد ڈھیر سارا گُڑ ڈال کر چلا گیا۔

اب شام ہوگئی تھی۔ بندریا نے اپنے بالوں کو پیار سے چوما اور اٹھ کر انھیں ہوا میں ادھر ادھر بکھیر دیا۔ پھر سب کچھ سمیٹ کر ایک

سنسان جگہ کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک چھوٹا سا مکان بنایا۔ گُڑ سے دیواریں بنائیں اور گنّوں سے ان پر چھت ڈال دی۔ پھر گھی سے دیواروں کو لیپ کر چاولوں سے گل کاریاں کیں۔ جب گھر تیار ہوگیا تو اس کے دو بچے ہوئے۔ایک کا نام رکھا ایمنا اور دوسرے کا میمنا۔

وہ سارا دن کھانے کی تلاش میں گھر سے باہر رہتی۔ جب بچوں کو دودھ پلانے آتی تو باہر سے یوں صدا لگاتی:

''بچہ ایمنا، بچہ میمنا! دروازہ کھولو۔ دودھ پی لو۔''

دونوں بچے کھیل روک کر دروازہ کھول دیتے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک بڑا بھیڑیا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جب بندریا بچوں کو دودھ پلا کر چلی گئی تو وہ آیا اور اپنی بھدّی سی آواز میں پکارا:

''بچہ ایمنا، بچہ میمنا! دروازہ کھولو۔ دودھ پی لو۔''

چھوٹا بچہ میمنا دوڑا کہ ماں آگئی ہے۔ایمنا نے کہا دروازہ نہ کھولنا، یہ آواز ماں کی نہیں۔ لیکن چھوٹا بہت ضدی اور جلد باز تھا۔ اس نے بڑے بھائی کا کہا نہ مانا اور ضد کر کے دروازہ کھول دیا۔

بس پھر کیا تھا۔ بھیڑیا اندر آیا اور دونوں کو چٹ کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد بندریا آئی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ جب اس نے آواز لگائی تو بھیڑیا جھٹ دروازہ کھول کر بھاگا۔ بندریا روتی روتی اس کے پیچھے ہولی۔ لیکن اسے کیسے پکڑتی وہ بھاگ گیا۔

بے چاری بندریا کوکتی کوئل کے ساتھ مل کر روئی۔ اس نے ننھے طوطوں سے پوچھا لیکن آج تک اسے ایمنا اور میمنا نہیں ملے۔ □

بچّو، یہ ہیں مرزا حامد بیگ۔ شاید آپ ان سے زیادہ واقف نہ ہوں لیکن دنیا بھر کے اردو والے مرزا صاحب کی ادبی خدمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یوں تو زیادہ تر لوگ انھیں تحقیق اور تنقید کا ماہر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی 28 کتابیں ادبی تحقیق اور تنقید کے ہی بارے میں ہیں۔ لیکن کہانیاں بھی انھوں نے خوب لکھی ہیں۔ کہانیوں کی چار کتابیں آچکی ہیں۔ ایک طویل کہانی 'حمیدہ کی کہانی' کو اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے دنیا کی 16 زبانوں میں چھاپا ہے۔ ہندی میں بھی کہانیوں کی ایک کتاب چھپی ہے۔ آپ کا رسالہ انھیں بے حد پسند آیا ہے اور اس میں سلام بن رزاق کی دو کہانیاں پڑھنے کے بعد ان کے دل میں بھی بچّوں کے لیے کہانیاں لکھنے کا شوق جاگا ہے۔ تو آیئے 'بچّوں کی دنیا' میں اردو کے ایک اور بڑے ادیب مرزا حامد بیگ کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ جو کہانی آپ پڑھیں گے اس میں انھوں نے ایک بندریا کی چالاکی اور عقل مندی اور اس کے بچّوں کی نادانی کے ذریعے اپنا پیغام دینے کی کوشش کی ہے! ن ظ

Mirza Hamid Baig
225 Nashtar Block Allama Iqbal Town, Lahore. Pakistan

کہانی

□ محمد داؤد

نانا کی چھتری

آج کئی روز کے بعد بارش ہوئی تھی اور ہم چھت پر بیٹھے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا مزہ لے رہے تھے۔ نازش اور صفو تو لڈو میں مگن تھے اور امجد اور رضوانہ کیرم کی کھٹ پٹ میں مصروف تھے اور کبھی اسٹرائیکر کے لائن سے ادھر ادھر ہونے پر جھگڑ بھی پڑتے تھے۔ صبیحہ 'بڑوں کا بچپن' لیے بیٹھی تھی اور کچھ نوٹس بھی بنا رہی تھی کہ کون صاحب دنیا میں کب تشریف لائے اور بچپن میں ان کے کیا رجحانات تھے اور یہ طے کر کے بیٹھی تھی کہ کوئی آئے یا جائے پہلے یہ کتاب پوری ہوگی۔ خیر بارش رکی تو نانا جان تشریف لائے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا کیونکہ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا نانا جان کو دیکھے ہوئے۔

ہم نے جلدی سے دروازہ کھولا اور آگے بڑھ کر نانا جان کے ہاتھ سے سامان لیا۔ صبیحہ نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا مگر پھر اپنی کتاب 'بڑوں کا بچپن' میں مگن ہوگئی جیسے وہ ان بڑوں کی صحبت میں بیٹھ کر خوش گپیاں کر رہی ہو اور وہ سب اس کے ہم عمر ہوں۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم نے نانا جان سے اتنے دن بعد تشریف لانے کی وجہ پوچھی۔ امجد نے بیچ میں لقمہ دیا کہ کئی روز بعد آنے کی وجہ جو بھی آپ بتائیں وہ تو ہم سن ہی لیں گے لیکن آنے سے قبل آپ نے فون پر جو کہا تھا کہ بھئی دعا کرنا خیریت سے تم لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں وہ کیا بات ہے۔ نانا جان نے کہا، ''میاں کیا بتاؤں ایک صاحب سے بڑی تکرار ہوگئی۔ کئی لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو نمٹایا اور ہم خیریت سے یہاں آ گئے۔''

ہم سب بڑی حیرت سے نانا جان کو دیکھنے لگے۔ اللہ خیر کرے نہ جانے کیا مصیبت آ پڑی تھی جو نوبت تکرار کی آ گئی۔ ہم نے بڑے ہی خوشامدانہ انداز میں کہا، ''نانا جان ہمیں بتا تو دیجیے۔ آپ نے تو ہمارا خون سکھا دیا اب زیادہ امتحان نہ لیجیے جلدی سے پورا قصہ سنائیے تاکہ پھر دسترخوان کی خاطر تواضع کی جا سکے۔''

نانا بولے، ''اچھا تو سنو! کیا بتائیں ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے: ہوا یہ کہ جب دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بس سے اترے تو اپنا بیگ بھی سنبھالا اور اپنی چھتری جو ایک کونے میں رکھی تھی اٹھانے لگے۔ جیسے ہی ہم نے چھتری کو ہاتھ لگایا فوراً ایک صاحب جو ہمارے ہی ساتھ سفر کر رہے تھے اور غالباً اسی شہر کے رہنے والے ہیں بولے شریمان جی یہ چھتری تو ہماری ہے آپ کی نہیں۔ ہم نے کہا خوب! اس چھتری سے آپ کا کیا واسطہ! یہ تو ہماری ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو خریدی تھی۔ یہ دیکھیے کیش میمو بھی ہے۔ اور پھر اپنے بیگ سے نکال کر ہم نے کیش میمو دکھا دیا۔ گوپال اینڈ سنس جنرل مرچنٹ گھنٹہ گھر شاہ آباد۔

وہ صاحب بولے ''کچھ بھی ہو یہ چھتری میری ہے میری ہے

آپ سے بھول ہورہی ہے آپ اپنی چھتری کہیں اور تلاش کریں۔''

بات بہت آگے بڑھ گئی اور ہماری بحث وتکرار تو تو میں میں کے دائرے میں پہنچ گئی۔ وہ تو کچھ لوگ بیچ میں پڑ گئے اور انہوں نے بڑی انصاف کی بات کہی کہ بھائی صاحب دیکھتے نہیں ہو بڑے میاں تم سے دوگنی عمر کے ہیں کیا یہ جھوٹ بولیں گے؟ جاؤ میاں جی جاؤان کو کہنے دو! تو یوں اللہ میاں نے غیب سے ہمارے طرف دار پیدا کردیے اور چھتری ہاتھ میں لے کر ہم نیچے اتر آئے۔

جیسے ہی چلنے لگے تو وہ صاحب بولے 'اچھا ایسا کیجیے یہ ہمارا پتہ اور موبائل نمبر رکھ لیجیے کیا پتہ کبھی آپ کو ہماری ضرورت پڑھ جائے۔' ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی پرچی جیب میں رکھ لی، رکشا پکڑی اور گھر کا رستہ لیا۔ واقعی آج کچھ لوگ ہماری طرف سے نہ بولتے تو یہ تیسری چھتری بھی گئی تھی۔ اب تو میں نے چھتری نہ خریدنے کا عہد کرلیا ہے۔ آخر کہاں تک خریدے جاؤں؟''

ہم سب نانا جان کی فتح پر بڑے خوش ہوئے۔ ورنہ یہ تو ہر بار کچھ نہ کچھ کھو کر ہی آتے ہیں۔ صبیحہ پورے انہماک سے اپنی کتاب پڑھ رہی تھی اور کبھی کبھی ہماری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ اپنے اوپر کچھ جبر کررہی ہے۔ خیر تھوڑی دیر میں نانا جی کی کہانی پوری ہوگئی اور ادھر صبیحہ نے اپنی کتاب کا آخری ورق بھی پورا کر ڈالا۔ وہ سیدھی اندر کمرے میں گئی اور ہاتھ میں چھتری لیے اس طرح باہر آئی جیسے کوئی فتح کا جھنڈا لے کر چل رہا ہو۔

''نانا جان! آپ کی چھتری تو یہ ہے۔ چلتے وقت آپ بھول گئے تھے۔ یہ آپ نے کس کی چھتری پہ ہاتھ صاف کردیا!'' یہ سننا تھا کہ ہم سب سکتے میں آگئے۔

نانا جان کا بھی شرمندگی سے برا حال تھا۔ بولے'' اب کیا ہوگا میں نے چھتری ہی اپنی نہیں بتائی اس شخص کو بہت سخت سست بھی کہا۔ اب میں کہاں جاؤں کیا کروں۔ یا اللہ تجھے تو بعد میں منہ دکھانا ہوگا اس بے چارے کا کیا حال ہوگا، میرے بارے میں وہ نہ جانے کیا کیا خیال کررہا ہوگا؟ یہ عمر اور یہ کارنامے!! بھئی تم لوگ کچھ کرو۔ مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلاؤ۔''

ہم سب نے نانا جان پر سوالوں کی برسات کرڈالی۔ ''اس شخص کا نام، پتہ، حلیہ، محلّہ، ہندو تھا یا مسلمان؟ کچھ تو بتائیں۔ اتنا بڑا شہر کہاں ڈھونڈیں، کیسے ڈھونڈیں۔ یہ تو تالاب میں سوئی تلاش کرنا ہوگیا۔''

نانا جان بے حد شرمندہ تھے۔ کچھ نہیں بولے بس اتنا کہا،'' دیکھو چلتے وقت اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر تو دیا تھا، لو دیکھ لو۔''

نانا جان نے جیب سے کاغذ نکال کر ہماری طرف بڑھادیا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے ٹیلی فون پر نمبر ملائے اور جب دوسری طرف سے جواب آیا، 'ہیلو کون؟' تو ہم نے کہا کیا رمیش چند شرما جی بول رہے ہیں؟ اُدھر سے کہا گیا،'' ہاں! ہاں میں رمیش چند شرما ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟'''' ہم نے کہا ہم یہاں محلّہ دیوان سے بول رہے ہیں۔ ہمارے نانا جان نے بتایا ہے کہ سفر میں چھتری کی بھول ہوگئی اور وہ آپ کی چھتری لے آئے ہیں۔ اب وہ بہت پریشان ہیں آپ اپنا پورا پتہ بتادیں تو ہم خود آپ کی چھتری لے کر آجائیں۔ دوسری طرف سے آواز آئی،'' آپ ایسا نہ کریں میں خود ایک گھنٹے بعد اُدھر آرہا ہوں'' اور پھر شرما جی خود ہی ایک گھنٹے بعد آگئے۔

نانا جی بہت نادم تھے لیکن شرما جی نے ان کو کچھ بھی برا بھلا نہیں کہا، بلکہ بولے'' آپ کے نانا جان تو ہمارے پتا سمان ہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ دیکھیے، اس برائی میں بھی خدا نے کیسی اچھائی پیدا کردی۔ ہمارا آپ سے میل کرادیا۔''

نانا جان نے بہت ہی شکریہ ادا کیا اور اپنی سخت گفتگو پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے شرما جی کو چھتری تھمادی۔ شرما جی نے ہنستے مسکراتے ہوئے اپنی چھتری لی اور ہمارے ہاتھ میں ایک مٹھائی کا ڈبہ تھمادیا۔

''یہ کیا!''

بولے'' یہ ایک نیا رشتہ قائم ہونے کی خوشی میں!'' □

Dr Mohd Dawuod
Multani Clinic Lohari Saran, Nagina-246762

□لیوٹالسٹائی ترجمہ: محمد یوسف انصاری

اڑنے والی لومڑی

لیوٹالسٹائی نے لومڑی کے کردار والی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں جن کا دنیا کے ادب میں اونچا درجہ ہے۔ یہ بھی ان ہی کی ایک کہانی ہے۔ پڑھیے اور لطف اٹھایئے

لومڑی کی عیاری اور مکاری کے چرچے جنگل میں ہوا کی طرح چاروں طرف گشت کررہے تھے۔ طرّہ یہ کہ اس نے ظلم وستم کابازار بھی گرم کررکھا تھا۔ کبھی خرگوش کو اٹھالیا تو کبھی بندر اور ہرن کے بچوں

کو ہڑپ کرلیا۔ اس کے خوف سے خشکی کے جانور پانی میں چھپتے پھرتے تھے۔ گویا لومڑی نہ ہوئی، شیر ہوگئی۔ مگر یہ اس کے حق میں بہت برا ہوا۔ گویا اس نے اپنے ہی پیروں پر آپ کلہاڑی ماری۔

ہوا یوں کہ اس کے شکار اس سے دور بھاگنے لگے، اور لومڑی کو کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مگر وہ لومڑی ہی کیا جو اتنی آسانی سے اپنی ہار مان لے۔ اس کی تدبیر کے جھولے میں مکروفریب کے بہت سے جال تھے۔ دغا کے اچوک تیر تھے۔ جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتے تھے۔ عبادت کا ڈھونگ رچا کر شکار کرنا اس کا آزمایا ہوا اور کارآمد نسخہ تھا۔ بس اس نے مصلّی بچھایا، ہاتھ میں تسبیح لی اور عبادت کرنے بیٹھ گئی۔

اس جنگل میں ایک سارس تھا، بڑا موٹا تازہ اور قدآور! اس نے

مکاری اور چالاکی میں گویا ایم اے کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی۔ میٹھی میٹھی باتیں کر اور نرمی سے کام لینا اس کے خاص سبجیکٹ تھے۔ لومڑی سے بدلہ لینے کی آگ برسوں سے اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ لومڑی نے اس کے پرکھوں کے ساتھ جو ظلم وستم ڈھائے تھے ایک ایک کرکے اسے یاد آرہے تھے۔ اسے سارس بچے کی مظلوم داستان یاد آئی۔ سارس بچے کو دیکھ کر اس مکارہ نے کہا تھا کہ ”میرے پیارے بچے! میرے حلق میں ہڈی پھنس گئی ہے، مہربانی سے اپنی چونچ حلق میں ڈال کر ہڈی تو نکال دو۔ اللہ اس کا بڑا ثواب دے گا۔“ وہ معصوم بچہ اس کے مکروفریب میں آگیا۔ اس نے جوں ہی چونچ حلق میں ڈالی لومڑی نے اسے دبوچ لیا۔ حالانکہ اس کے گلے میں کوئی ہڈی نہیں پھنسی تھی۔

پھر اسے اپنے دادا جان کی کہانی یاد آئی۔ وہ دعوت یاد آئی۔ دعوت کیا تھی ایک عداوت یعنی دشمنی تھی۔ دلیا خود ہی چٹ کر گئی تھی اور اس کے دادا جان بھوکے رہ گئے تھے۔ ایسی ہی بے شمار کہانیاں یاد آرہی تھیں جو دوسرے جانوروں کے ساتھ پیش آئی تھیں۔

اسے خرگوش اور اس کے معصوم بچوں کی ظلم بھری داستان بھی یاد آئی اور اس کا خون کھولنے لگا۔ ایک خرگوش اپنی بیوی بچوں کو لے کر روزانہ چہل قدمی کے لیے نکلتا تھا۔ آگے آگے میاں بیوی اور پیچھے پیچھے ان کے بچے قطار میں ایک کے پیچھے ایک ہوتے تھے۔ ظالم لومڑی کو بھنک لگ گئی کہ فلاں جگہ سے خرگوشوں کا قافلہ روزانہ گذرتا ہے۔ بس اس مکارہ نے عبادت کا ڈھونگ رچایا۔ جوگی کا چولا پہنا اور ہاتھ میں مالا لے کر

اس جگہ بیٹھ گئی جہاں سے خرگوشوں کا قافلہ گزرتا تھا۔ ایسی مسکین صورت بنالی جیسے اس جیسی عبادت گزار ہستی جنگل میں اور کوئی نہ ہو۔ جب خرگوش ادھر سے گذرنے لگے تو منہ میں کچھ بدبدانے اور کھٹ کھٹ مالا جپنے لگی۔ خرگوش احترام سے سر جھکائے اس کے سامنے سے گذر جاتا۔ جب قافلہ گذر جاتا تو وہ مکارہ قطار کے سب سے آخری بچے کو اس طرح دبوچ لیتی کہ آواز نکالے بغیر وہ اس کا لقمہ بن جاتا۔ اس طرح روزانہ ایک ایک بچہ کم ہوتا گیا، تو خرگوش اور اس کی بیوی کو تشویش ہوئی کہ بچے آخر کہاں جاتے ہیں؟ خرگوش کو لومڑی پر شک ہوا۔ اس نے دوسرے دن یہ ترکیب کی کہ آخر میں خود چلنے لگا۔ لومڑی نے عادت کے مطابق اس پر پنجہ گاڑا۔ مگر خرگوش ہوشیار تھا۔ اس کی گرفت سے پھسل کر بھاگا۔ اب لومڑی کی پول کھول چکی تھی۔ وہ جوگن نہیں ناگن تھی۔ پھر خرگوش نے چہل قدمی کرنا چھوڑ دیا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اس فتنہ لومڑی کے کرتوت کوئی کہاں تک سنائے اس کے ظلم وستم کی داستان تو جنگل کے پتے پتے پر درج تھی۔ کہنے سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ مگر کوئی کرے بھی تو کیا کرے۔

ایک دن سارس اس طرف آنکلا جدھر لومڑی کپڑا بچھا کر عبادت میں مشغول تھی۔ سارس بھی مکاری میں ہوشیار اور عیاری میں استاد تھا۔ میٹھی زبان سے سننے والوں کا دل موہ لیتا تھا۔ یوں لگتا ہے بچّو جیسے اس نے مشہور ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی کی کتاب ’میٹھے بول میں جادو ہے‘ پڑھ رکھی تھی اور اس پر عمل بھی کرتا تھا۔ مجال ہے کسی بات پر اس کے ماتھے پر بل آجائے۔ کڑوی سے کڑوی بات کو سکون سے سنتا اور جواب

اتنی میٹھی زبان میں دیتا جیسے اس کی زبان شہد میں ڈوبی ہو، اور اسی سے اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ حالانکہ اس کے دل و دماغ میں لومڑی کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ مگر اس نے بہت ضبط سے کام لیا، اور حکمت عملی سے لومڑی کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ سینہ تانے بڑی شان و شوکت سے وہ لومڑی کی طرف بڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شاہی دربار میں پیشی کے لیے جا رہا ہو۔

لومڑی نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا اور دل ہی دل میں کہنے لگی، کیسا موٹا تازہ جانور ہے، کم بخت کی ٹانگیں ہیں یا بانس کی سیڑھی یہ تو کھیر سے بھی زیادہ ٹیڑھی ہیں۔ نہ بابا نہ، ایسے شکار کو دور سے سلام۔ کم بخت کی ٹانگیں اگر حلق میں پھنس گئیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جب وہ لومڑی کے قریب پہنچا تو لومڑی نے آنکھیں موند لیں، اور تسبیح کے دانے گھٹ گھٹانے لگے۔ مگر کن انکھیوں سے سارس کو دیکھ رہی تھی۔ سارس نے نہایت ادب سے سلام عرض کیا۔ ''آداب خالہ جان! مزاج کیسے ہیں؟ بہت دنوں بعد اس طرف نظر آئیں، کیا حج کے لیے تشریف لے گئی تھیں۔'' دونوں ایک دوسرے کو باتوں باتوں میں بے وقوف بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

''ارے بیٹا! مجھ گنہگار کی قسمت میں حج کہاں؟''

''آپ ملال نہ کیجئے، میں آپ کو حج لیے بھیجوں گا۔'' سارس کا مطلب تھا براہِ راست خدا کے پاس بھیج دوں گا۔

لومڑی خوش ہو کر بولی ''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے، تمہاری عمر دراز ہو۔ آمین!''

''اور سنایئے حال چال کیسے ہیں؟''

''حال تو تم دیکھ ہی رہے ہو، اور چال الٹی پڑ رہی ہے۔''

''خالہ جان! میں عقل سے کورا ہوں، آپ کی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ صاف صاف کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''بھتیجے! زندگی ناگ بن کر ڈس رہی ہے۔ رات کٹتی نہیں، دن گزرتا نہیں، زخم ایسا ملا ہے کہ بھرتا نہیں۔''

''ارے خالہ جان آپ تو منشی فغاں کی فغانی سنانے لگیں۔ ذرا کھول کر کہیے کہ کیا بات ہے۔ کون سی ہے وہ مشکل جو آساں نہ ہو۔ بس مصیبت میں انساں پریشاں نہ ہو۔''

''کیا کہوں کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے، اپنوں سے نہیں۔ کیا آپ مجھے

غیر سمجھتی ہیں۔"

"ارے نہیں بھتیجے! تم تو میرے دل کے بہت قریب ہو۔"

"تو پھر پہیلیاں نہ بجھاؤ، دل کا مدعا بیان کرو۔"

اب لومڑی نے نہایت غمگین لہجے میں کہا جیسے اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ "میرے عزیز! ایک دن گور (قبر) گڈھے میں ہمیں سونا ہوگا۔ جہاں تکیہ نہ رضائی نہ بچھونا ہوگا۔ اب تو بھوکوں مرنے کی نوبت آ گئی ہے۔"

سارس بولا "مریں آپ کے دشمن، آپ سلامت رہیں ہزار برس۔ مایوسی کفر ہے، جس نے پیدا کیا ہے وہی غذا دے گا۔ جس نے درد دیا ہے وہی دوا بھی دے گا۔ دل چھوٹا مت کیجیے، ہمت سے کام لیجیے۔"

لومڑی بولی "میں نے سوچا، جب مرنا ہی ہے تو اللہ کے راستے میں کیوں نہ مروں، اسی لیے چلّہ کشی اختیار کی۔ مگر اس میں میری بھی ایک غرض ہے۔"

"ارے خالہ جان! عبادت خدا کو راضی کرنے کے لیے کی جاتی ہے، اس میں خود غرضی کا کیا کام؟"

"بھتیجے! تم پوری بات سنتے ہی نہیں، درمیان میں ہی بول پڑتے ہو۔ دراصل عبادت کے ساتھ ساتھ خدائے رب العزت سے یہ دعا بھی مانگتی ہوں کہ اے پاک پروردگار! مجھے اڑنا سکھا دے۔"

"اے لو! بھلا عبادت کی اڑنے سے کیا نسبت" سارس نے تعجب سے پوچھا۔

لومڑی نے کہا "تاکہ پرندوں کا شکار آسانی سے کرلوں۔ پیٹ میں خوراک جائے تو طاقت آئے، طاقت آئے تو عبادت کروں۔ تم جانو، چلّہ کشی کرنا بچوں کا کھیل نہیں، جب زندہ ہی نہ رہوں گی تو عبادت کس طرح کروں گی؟ چلّہ کس طرح پورا ہوگا؟"

"اوہ خالہ جان! آپ تو گھما پھرا کر باتیں کرتی ہیں، تو یوں کہیے نا کہ آپ اڑنا سیکھنا چاہتی ہیں۔ آیئے میں آپ کو ایک گھنٹے میں اڑنا سکھا دوں گا۔"

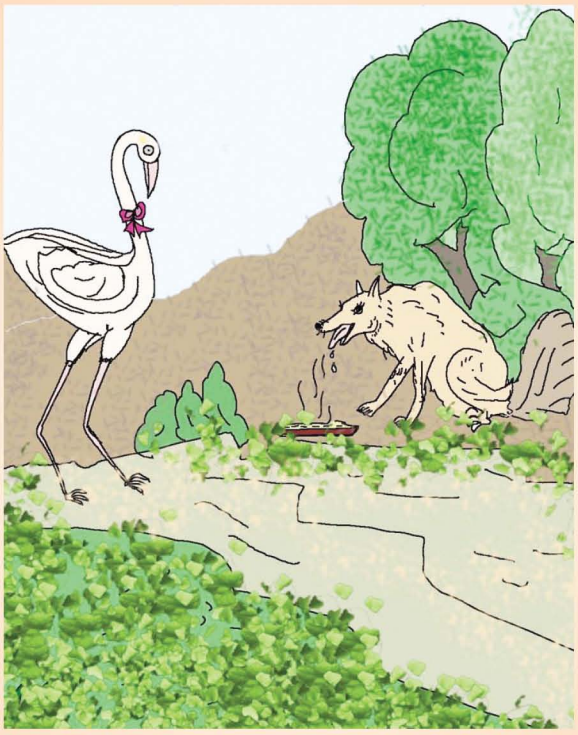

لومڑی کی تو دل کی کلی ہی کھل گئی۔ خوش ہوکر بولی "سچ کہتے ہو، بھتیجے! کہیں مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"پیاری خالہ جان! بزرگوں سے مسخرہ پن کرنا شریفوں کا کام نہیں۔ آپ آیئے! مجھ پر سوار ہوجایئے! ابھی اڑنا سکھاتا ہوں۔" لومڑی اچک کر سارس کی پشت پر جا بیٹھی۔

سارس اسے لے کر اڑا، اونچا خوب اونچا، اڑتے اڑتے ایک جگہ اسے تالاب نظر آیا، بس اس کی رگِ شرارت پھڑکنے لگی۔ اس نے اپنے بدن کو ذرا سی حرکت دی اور لومڑی غڑاپ سے تالاب میں گر گئی، بڑی مشکل سے کنارے پر پہنچی۔ تب ہی سارس بھی اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑی لجاحت سے کہا "اوہ خالہ جان میں بہت شرمندہ ہوں، میری وجہ سے آپ گر پڑیں، دراصل یہ بات ہوئی تھی کہ میرے بدن میں کھجلی ہو رہی تھی، اس لیے میں نے پروں کو سمیٹا اور آپ گر پڑیں۔ معاف کیجیے گا۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"پیروں میں معمولی سی چوٹ آئی ہے، ویسے کوئی تکلیف نہیں۔"

"چلیے میں آپ کو بندروں کی برادری کے حکیم جعلی نوس کے پاس

لے چلتا ہوں وہ بہت پہنچے ہوئے تجربہ کار حکیم ہیں۔ بڑا اچھا علاج کرتے ہیں۔"

لومڑی ناک بھوں سکڑ کر بولی "کون وہ کالے منہ کا بندر، گھر کا نہ گھاٹ کا، نجس، ناپاک، بدبو کا ڈھیر، گندگی کی پوٹلی، کم بخت کبھی غسل نہیں کرتا، اور تو اور جوئیں کھاتا ہے، دیکھ کر ابکائی آتی ہے۔ اگر میں جنگل کی رانی ہوتی تو سب سے پہلے اس منحوس جانور کو جنگل بدر کرتی۔ جنگل کو پاک کرتی میں تو اس کے سائے پر بھی نہ تھوکوں۔"

سارس بولا "اوہ خالہ جان! ہم تو اس کے پاس علاج کے لیے جارہے ہیں نہ کہ اس کا شکار کرنے۔ اگر اسے دیکھ کر بھی آپ کا جی متلاتا ہے تو نہ سہی۔ چلیے میں آپ کو دوسرے جہاں کی سیر کرادوں۔ جہاں قطار در قطار پرندے بے شمار ہیں۔ اُس جنگل میں صرف پرندے بستے ہیں۔ ایک جال ڈالو تو سینکڑوں پھنستے ہیں۔ تیتر، بٹیر، ہریل فاختائیں اور اتنے جانور کہ مجھے نام تک یاد نہیں۔ کہنے سننے سے بہتر ہے چل کر دیکھتے ہیں۔"

پرندوں کے نام سے لومڑی کی زبان تر ہوگئی۔ بے تابی سے بولی "میں تو چلنے کو بے قرار ہوں، ایک ٹانگ پر کھڑی کب سے تیار ہوں، پیارے بھتیجے مجھے کب دوسرے جہاں کی سیر کراؤ گے؟"

سارس بولا "ابھی چلتے ہیں۔ نیک کام میں دیر کس بات کی؟ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آیئے! میری کمر پر بیٹھ جایئے۔"

لالچ نے لومڑی کو اندھا کر دیا تھا۔ بلا سوچے سمجھے سارس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ سارس نے دل میں کہا "لو آپ اپنے دام میں صیاد (شکاری) آ گیا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چھا گیا۔"

جب لومڑی پیٹھ پر بیٹھ گئی تو سارس نے گرہ لگائی، "خالہ جان میرے پروں کو مضبوطی سے تھامے رہیے گا۔"

لومڑی اترا کر بولی "فکر نہ کرو بھتیجے مجھے اچھا تجربہ ہے۔"

سارس اسے لے کر اڑا، اونچا، اونچا، خوب اونچا، اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کا تارہ بن گیا۔ لومڑی کو اونچی اڑان کا مزہ آرہا تھا۔ بے وقوف کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ موت کی اڑان تھی۔ سارس نے کئی ندی نالے اور ٹیلے پار کیے، کھیت کھلیانوں کو پیچھے چھوڑا اور اڑتا رہا۔ دراصل اسے ایسے مقام کی تلاش تھی جہاں نوکیلی چٹانیں ہوں۔ آخر کار اسے ایک سوکھی ندی نظر آہی گئی۔ جس کے دونوں طرف دور تک نوکیلی چٹانیں تھیں۔

سارس نے دل میں کہا "ہاں! اس ناہنجار کے لیے یہی جگہ ٹھیک ہے۔" بس اس نے کاوا کاٹ کر جو جھٹکا دی تو ظالم لومڑی سر کے بل چٹانوں پر گری، اور اس کا بھیجا تک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ سارس نے راحت کی سانس لی کہا "خس کم جہاں پاک۔ میرا بدلہ پورا ہوا۔ بدلے جانوروں کو راحت ملی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

سدا ظلم کی ناؤ چلتی نہیں ہے یہ چلتی ہے لیکن سنبھلتی نہیں ہے

Mohd Yusuf Ansari
368, New Ward, Malegaon, Nasik-423203 Maha.

برما کی کہانی

□ مترجم: نصر ملک

چار کٹھ پُتلے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑھئی تھا جو کٹھ پتلیاں بناتا تھا۔ اُس کا بیٹا تھا جس کا نام تھا اونگ۔ باپ کا خیال تھا کہ اُس کا بیٹا بھی اُسی کی طرح لکڑے کے پُتلے بنانے والا بنے گا۔ لیکن اونگ کی اس کام میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

ایک دن اونگ نے کہا۔ ''باپو میں نے گھر چھوڑنے اور کہیں اور جا کر قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

کٹھ پُتلیاں بنانے والے نے کام کرتے ہوئے نگاہ اوپر اٹھائی اور کہا، ''بیٹے، میں چاہتا ہوں کچھ دیر ٹھہرو۔ کٹھ پتلیاں بنانے والے کی زندگی بڑی عزت کی زندگی ہے۔ لیکن اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو میں تمھیں تمھارے سفر کے لیے کچھ ساتھی دیتا ہوں۔''

اس نے اپنے بیٹے کو چار لکڑی کے پتلے دکھائے جو اُس نے بڑی محنت سے مختلف رنگ و روغن لگا کر اور بہت خوبصورت کپڑے وغیرہ پہنا کر تیار کیے تھے۔ ''ان میں سے ایک ہر ایک پتلا اپنی خاصیت اور اہمیت رکھتا ہے۔'' اس نے کہا۔

پہلا پتلا، دیوتاؤں کے دیوتا کا تھا۔ اُس نے بتایا ''دیوتا کی خوبی اس کی حکمت اور دانش مندی ہے۔''

دوسرا ہرے چہرے والا پُتلا، راکشس یعنی جن تھا۔ ''یہ ہے عظمت اور قوّت کی نشانی۔'' اُس نے کہا۔

تیسرا پتلا، جادوگر کا تھا۔ اس کی جادوئی خوبی تھی اس کا علم۔

چوتھا پُتلا، مقدّس راہب یعنی پجاری پنڈت کا تھا۔ اُس کی خاصیت نیکی اور بھلائی تھی۔

''یہ پتلے راستے میں تمھاری مدد کریں گے۔'' اُس نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''لیکن یاد رکھنا، قوّت اور علم ہمیشہ حکمت اور بھلائی کے لیے ہی استعمال کرنا چاہیئے۔''

اگلے دن اونگ اپنے سفر پر چل پڑا۔ اُس نے اپنے کاندھے پر بانس کا ایک ڈنڈا اُٹھا رکھا تھا۔ جس کے ایک سرے پر کچھ کھانے اور کپڑوں کی ایک بڑی سے پوٹلی لٹک رہی تھی اور دوسرے سرے پر وہ چاروں کٹھ پُتلے اپنے ڈوریوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔

جب رات ہوئی تو اونگ نے خود کو ایک گھنے جنگل کے بیچ میں پایا اور وہ ایک برگد کے پیڑ کے نیچے رُک گیا۔

''یہ سونے اور آرام کرنے کے لیے ایک اچھی جگہ دکھائی دیتی ہے۔لیکن کیا یہ محفوظ بھی ہے؟'' اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

پھر اونگ کو ایک دلچسپ خیال آیا۔'' مجھے ان پتلوں سے بھی پوچھنا چاہیئے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے دیوتاؤں کے دیوتا سے پوچھا، ''مجھے بتاؤ کہ کیا یہ جگہ میرے ٹھہرنے کے لیے محفوظ ہے؟''

وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا اور حیران رہ گیا کہ پُتلے میں جان پڑ گئی۔ وہ بانس کے سرے سے نیچے اُتر کر جونہی زمین پر آیا ایک زندہ آدمی جیسا بڑا ہو گیا۔

''اونگ،'' دیوتا بولا،'' تم اپنی آنکھیں کھولو اور اپنے ارد گرد دیکھو، حکمت کا پہلا قدم یہی ہے۔ اگر تم یہ دیکھنے میں ناکام ہو جاتے ہو کہ تمھارے سامنے ٹھیک کیا ہے تو تمھیں بہکانے اور غلط راہ پر لگانے میں دوسروں کو بہت آسانی ہوگی!''

اتنا کہہ کر پُتلا فوراً بانس کے سرے پر دوبارہ اپنی جگہ پر جا لٹکا۔

اونگ جب اپنے حواس پر کچھ قابو پا چکا تو اُس نے بڑے غور سے پیڑ کے ارد گرد دیکھا۔ ایک جگہ اسے نرم زمین پر ایک چیتے کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ اُس رات وہ زمین پر سونے کی بجائے پیڑ کے ایک بڑے ٹہنے پر سویا۔ آدھی رات کے وقت اچانک آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ چیتا وہاں آیا تھا اور جس ٹہنے کے اوپر وہ سو رہا تھا چیتا اُس کے نیچے زمین پر کچھ سونگھ رہا تھا۔

اگلے دن اونگ پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی وہ سڑک سے ہٹ کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیا اور پہاڑیوں کے اوپر تھوڑا رستہ طے کر لیا۔ اب اُس کا یہیں رات بسر کرنے کا ارادہ تھا۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو اُس نے پہاڑیوں کے نیچے، سڑک پر ایک کاروان کو آتے دیکھا۔ ایک درجن کے قریب بیل گاڑیاں مختلف قسم کے قیمتی سامان سے لدی ہوئی تھیں۔

''یہ قافلہ تو یقیناً کسی امیر تاجر ہی کا ہو سکتا ہے!'' اونگ نے سوچا ''کاش میرے پاس بھی اتنی دولت ہوتی۔''

پھر اسے ایک خیال آیا اور اُس نے ہرے چہرے والے، راکشس جن سے بات کی، ''مجھے بتاؤ، میں دولت مند کیسے بن سکتا ہوں؟''

اونگ اب بڑے تعجب کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے راکشس جن کا پُتلا، بانس کے سرے سے نیچے زمین پر اُترا اور پھر پورے قد کا ایک زندہ آدمی بن گیا۔''اگر تمھارے پاس قوّت ہے تو تم جو چاہو لے سکتے ہو۔ اب دیکھو!'' یہ کہہ کر راکشس نے اپنے پاؤں کی ایڑی زمین پر دے ماری جس سے ساری زمین لرز گئی۔

''رکو!'' اونگ نے کہا۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ نیچے پہاڑی کی چٹانیں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی تھیں اور پہاڑی مٹی کے بڑے بڑے تودے اور پتھر سڑک پر جا گرے تھے اور انھوں نے راستہ بند کر دیا تھا۔ گاڑی بان ڈر کے مارے بیل گاڑیوں سے نیچے کُود کر بھاگ گئے تھے۔

''دیکھا تم نے!'' جن بولا۔

''کیا یہ اتنا آسان ہے؟'' اونگ نے پوچھا جو ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اُلٹی ہوئی بیل گاڑیوں کے پاس پہنچا اور اُن میں سے چیزیں نکال کر اپنے پاس رکھنے لگا۔ قیمتی ریشمی کپڑوں کے تھان اور قیمتی دھاتوں کے بنے ہوئے شمع دان غرضیکہ جو کچھ اُس کے ہاتھ لگا اُس نے اکٹھا کر لیا۔ ''یہ سب کچھ میرا

ہے!'' وہ چلّایا۔

عین اُسی لمحے اونگ کو کسی کے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑی میں پھنسی ہوئی عورت تھی جو سسکیاں لے رہی تھی۔ بالکل اونگ ہی کی عمر کی، خوبصورت نوجوان عورت رو رہی تھی اور ڈر سے کانپ رہی تھی۔

''ڈرو نہیں، میں تمھیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' اونگ نے کہا اور پوچھا ''تم کون ہو؟''

''میرا نام مالا ہے۔'' وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی۔ ''میرا باپ اس کاروان کا مالک ہے ہم اُسے ملنے کے لیے جا رہے تھے۔''

فوراً ہی اونگ کو محسوس ہوا کہ وہ اس نوجوان عورت پر عاشق ہو گیا ہے۔ وہ مالا کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ ''تم فکر نہ کرو۔'' اونگ نے کہا ''میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ہمیشہ تمھاری دیکھ بھال اور حفاظت کروں گا۔''

مالا سخت غصے میں تھی اور اُس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ ''ہاں، تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو، بالکل ایسے جیسے تم نے دوسری قیمتی چیزوں کو اُٹھا لیا ہے، مجھے بھی اُٹھا لو، لیکن یاد رکھو، تم صرف ایک چور ہو، چور! میں کبھی بھی تم سے بات نہیں کروں گی!''

اونگ کو سخت جھٹکا لگا۔ ''کیا میں سچ مچ ایک چور ہوں؟'' اُس نے سوچا۔ وہ پریشان تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کرے۔

اُس نے سُنا کہ کوئی اُس کے کان میں سرگوشی کر رہا ہے۔ یہ راکشس تھا۔ ''اس کی باتیں نہ سنو، وہ اپنا ذہن بدل لے گی۔ اور ہاں، سب سے اہم بات تو ہے کہ تم جو چاہتے تھے وہ تمھیں مل گیا ہے، چلو، اب چلیں۔'' اُس نے کہا۔

جن نے سڑک صاف کی اور پھر اونگ کی مدد کی کہ وہ کاروان کو لے کر آگے بڑھے۔ آخر وہ پہاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ اب وہ راجدھانی سے زیادہ دُور نہیں تھے۔

''مجھے اب کیا کرنا چاہیے، یہ سب جو قیمتی مال دولت ہے اس کا میں کیا کروں؟'' اونگ نے جن سے پوچھا۔

''مجھ سے مت پوچھو!'' جن نے جواب دیا۔

''بہتر ہے جادوگر سے سوال کرو۔''

اونگ نے جادوگر پُتلے سے پوچھا، ''کیا تم کچھ بتا سکتے ہو؟''

جادوگر پُتلا بانس کے کونے سے نیچے زمین پر اُتر آیا اور ایک زندہ آدمی بن کر ہوا میں اُڑتے ہوئے، اونگ کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

یہ منظر دیکھ کر مالا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور وہ بڑی حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری دولت بڑھے اور تم امیر سے امیر ترین ہو جاؤ تو تمھیں 'فطرت کے راز' سیکھنے چاہئیں۔'' جادوگر نے اونگ سے کہا۔ اور پھر اُسے اپنے سرخ گُرز کے ساتھ باندھ کر اپنے ساتھ ہوا میں اُونچائی پر لے اُڑا۔ اونگ نے جب ہوا میں اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد نیچے دیکھا تو اُسے ہر شے نئے انداز میں دکھائی دی۔

اب وہ بتا سکتا تھا کہ کون سی زمینیں کھیتی کے لیے زرخیز تھیں اور کن کن پہاڑوں کے نیچے سونا چاندی اور دیگر قیمتی دھاتیں چھپی تھیں۔

''یہ سب تو عجیب حیرت ناک ہے۔'' اُس نے سوچا۔ ''اب تو جو کچھ میں جانتا ہوں اُس سے لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں!'' اُسے خیال آیا۔

''بالکل، یقیناً تم ایسا کر سکتے ہو!'' جادوگر نے کہا۔ لگتا تھا اس

نے اونگ کی سوچ کو پڑھ لیا تھا ''لیکن علم قوّت ہے، کیوں نہ اسے تم صرف اپنے ہی پاس رکھو، کیا دوسرے سبھی لوگ ایسا ہی نہیں کرتے؟'' جادوگر نے کہا۔

''ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔'' اونگ نے کہا۔

اب وہ راجدھانی میں آ گئے تھے۔ اونگ ایک امیر تاجر بن گیا تھا اور راکشس اور جادوگر کی مدد سے وہ دن بدن پہلے سے بھی زیادہ امیر ہوتا گیا۔ اُس نے اپنے لیے ایک محل خریدا، اور لکڑی کے پُتلوں کو اُن کے لیے بنوائے گئے ایک خاص کمرے میں رکھ دیا۔

اب دیوتاؤں کا دیوتا بھی زندہ ہو کر، دبے پاؤں وہاں مقدس راہب کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

''اونگ، تم وہ سب کچھ بھول گئے جو تمھارے باپو نے تم سے کہا تھا! طاقت اور علم بہت سود مند ہیں لیکن انہیں ہمیشہ حکمت ودانائی اور نیکی کے لیے استعمال کرنا چاہیئے!'' اُس نے کہا۔

''نہیں میں نہیں بھولا۔'' اونگ نے کہا۔

اُس دن کے بعد، اونگ نے اپنی دولت اور طاقت کا لوگوں کی بھلائی کے لیے استعمال شروع کر دیا۔ اُس نے ایک عالی شان اونچا مندر تعمیر کرایا اور یہاں خانقاہ پر آنے والے غریب ومسکین زائرین اور یاتریوں کو کھانا اور پناہ مہیا کرنے لگا۔

ایک دن یاتریوں کے درمیان، اونگ نے ایک نوجوان عورت کو دیکھا جسے وہ اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ اُس عورت کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی بھی کھڑا تھا۔ وہ دونوں بڑے معمولی اور خستہ حال کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

''مالا!'' اونگ چلّایا۔ اور یاتریوں کے بیچ سے دوڑتا ہوا اُس نوجوان عورت کے پاس پہنچ گیا اور اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے بوڑھے کے پاؤں چھونے لگا۔ بوڑھا حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

''جناب، میں آپ کا بہت نقصان کر چکا ہوں۔ میں آپ سے تہہ دل سے معافی مانگتا ہوں۔ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ سب کچھ آپ ہی کا ہے اور میں یہ سب کچھ آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنے گاؤں واپس چلا جاؤں گا اور وہاں کٹھ پتلیاں بنایا کروں گا، جو میرا باپ بھی بناتا ہے۔'' اونگ جان چکا تھا کہ یہ بوڑھا اُس نوجوان عورت کا باپ ہی ہے اور وہ عورت، مالا ہی تھی۔

''باپو!'' مالا نے کہا۔ ''یہ اونگ ہے، لیکن اب یہ بالکل بدل چکا ہے!''

''دکھائی تو دیتا ہے۔'' باپو نے کہا ''اگر یہ واقعی بدل چکا ہے جیسے کہ تم کہہ رہی ہو تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی کہ اِس جیسے اتنی خوبیوں کے مالک نوجوان کو واپس جانے دیا جائے۔ شائد یہ میرے لیے کام کرنا اور محل میں ہمارے ساتھ رہنا پسند کرے۔''

چنانچہ اونگ تاجر کا نائب بن کر محل میں رہنے لگا اور کچھ عرصے بعد اُس کے کاروبار اور تجارت میں حصہ دار بن گیا اور پھر جب مالا بھی اس کی بیوی بننے کو راضی ہوگئی تو وہ تاجر کا داماد بن گیا۔

جہاں تک ان کٹھ پُتلوں کا تعلق ہے، اونگ اب بھی ضرورت پڑنے پر اُن سے مشورہ لیتا ہے۔ وہ بھی اس کی بڑی مدد کرتے اور اُسے طاقت اور علم مہیا کرتے ہیں، لیکن اونگ ہمیشہ عقل دانش مندی اور نیکی ہی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ □

ڈینش زبان سے ترجمہ، بشکریہ نصر ملک

Nasr Malik
Copenhagen, Denmark

سچّی کہانی

□ادریس صدیقی

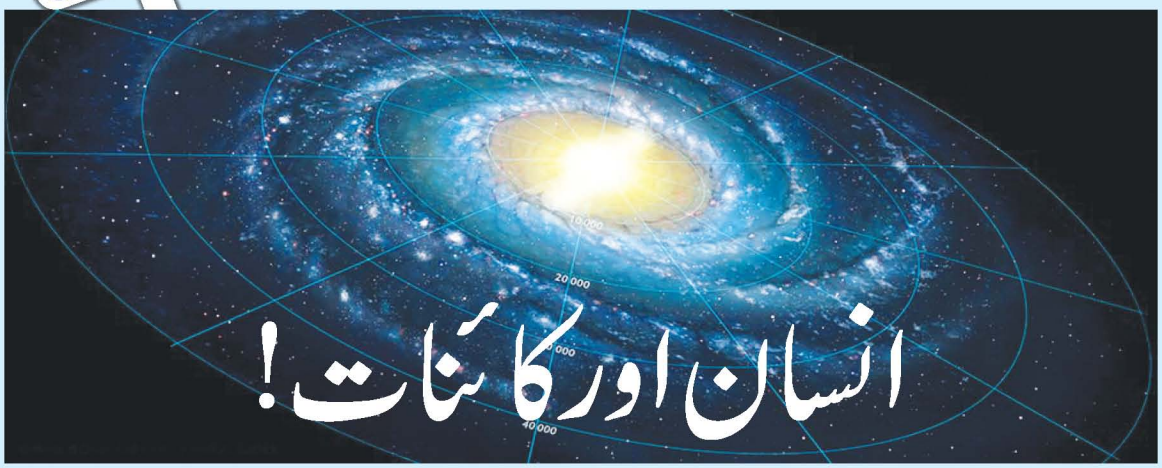

انسان اور کائنات!

ہر شام کو زیبا باہر کھلے میدان میں ٹہلتی ہے۔ اس کے ساتھ ندیم بھی ہوتا ہے۔ اکثر انھیں دیر شام آسمان میں چاند ستارے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ آج بھی یہی ہوا۔ وہ کافی دیر تک ٹہلتے رہے۔ زیبا نے اپنے بیٹے سے کہا ''ندیم دیکھو آسمان میں ایک الگ ہی دنیا ہے، وہاں صرف چاند ستارے اور سورج ہی نہیں ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ندیم ہائی اسکول میں پہونچنے والا ہے۔ اسے کائنات کے بارے میں جاننے میں بہت دلچسپی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ سب چاند ستارے کیا ہیں اور کیسے ہیں؟

ندیم کے پاپا کو بھی معلوم ہے کہ ان کے بیٹے کو کائنات میں بہت دلچسپی ہے۔ چونکہ وہ میڈیکل سائنس میں ہیں اور کئی طرح کی بیماریوں پر کام کرتے رہے ہیں، اس لیے ڈاکٹر طاہر چاہتے ہیں کہ ندیم ڈاکٹر بن جائے۔ لیکن ندیم نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا ''میں سائنس ضرور پڑھوں گا لیکن ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔ مجھے کائنات کے بارے میں پڑھنے کا شوق ہے۔''

''تو پھر تمہیں کاسمولوجی پڑھنا چاہئے۔'' ڈاکٹر طاہر اپنی پسند ندیم پر تھوپنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچے اپنی پسند کی تعلیم حاصل کریں تو زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مصیبت یہ رہی کہ ندیم بہت زیادہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کا دماغ دوسرے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ پاپا کو یہ سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا جب ندیم نے بتایا ''میں نے ایک ایسا کمپیوٹر بنایا ہے جو میتھ کے سوالوں کو حل کرتا ہے۔'' ڈاکٹر طاہر جانتے ہیں کہ ندیم بہت ذہین ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر پرانے پرزوں سے وہ کمپیوٹر بنایا ہے۔ البتہ ندیم دن بھر میں دو گھنٹے بھی پڑھنے میں نہیں لگاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر کو پریشانی تب محسوس ہونے لگی جب انھوں نے ندیم کو بات کرنے اور چلنے پھرنے میں لڑکھڑاتے ہوئے پایا۔ وہ ڈاکٹر تو نہیں لیکن میڈیکل پیشہ میں ضرور ہیں۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

''تم کل ہی ڈاکٹر کے پاس جاؤ گے۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔'' پاپا نے ندیم سے کہا۔ ندیم نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کئی دنوں سے چلتے ہوئے ڈگمگانے لگتا ہے۔ اس نے پاپا کی بات مانتے ہوئے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس شام ندیم نے پاپا اور ممی کو بتایا۔ ''آج میرے بہت ٹیسٹ ہوئے ہیں۔''

''کس قسم کے ٹیسٹ؟'' دونوں نے معلوم کیا۔

''میرے بازو سے خون کا نمونہ لیا گیا ہے۔'' ندیم بتانے لگا۔ ''لیکن ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن بہت تکلیف دہ رہا۔ اس کے بعد ہی میرے بستر کو اوپر نیچے کرتے ہوئے ایکسرے لیے گئے۔''

''اچھا ہے جو تمہاری بیماری کا پتہ چل جائے۔ ورنہ علاج کیسے ہوگا؟'' ان دونوں نے بیٹے کو تسلی دی۔

کچھ دنوں بعد اسپتال میں کیے گئے ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی۔ ندیم کے ساتھ گھر والوں کو بھی بہت صدمہ ہوا۔

''مجھے اے ایل ایس کی بیماری شروع ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں ڈھائی سال سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا۔'' ندیم نے ڈاکٹر کی بات چھپائی نہیں۔ ''مجھے سب کچھ بہت جلد کرنا ہے۔ پتہ نہیں کب میرا وقت ختم ہوجائے۔''

پروفیسر اسٹیفن ولیم ہاکنگ جن کی زندگی کو سامنے رکھ کر یہ کہانی لکھی گئی ہے، 8 جنوری 1942 کو انگلینڈ کے شہر آکسفرڈ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فرینک ہاکنگ نے آکسفرڈ یونی ورسٹی میں میڈیسن کی تعلیم حاصل کی اور ولیم ہاکنگ اس وقت بڑے مشکل حالات میں پیدا ہوئے جب لندن پر جرمن فوجیں بم برسا رہی تھیں۔ ولیم کے والد اور والدہ ازوبیل جو فلسفے اور معاشیات کی ماہر تھیں، دونوں ہی بے حد ذہین اور تھے۔ کھانا کھاتے وقت دونوں کوئی بات کرنے کی بجائے کسی کتاب کو پڑھنے میں کھوئے رہتے تھے۔ اس وجہ سے دونوں کو سنکی سمجھا جاتا تھا۔ ولیم کو آکسفرڈ میں بی اے کے آخری سال میں جسمانی کمزوری کا احساس ہوا ایک مرتبہ وہ لڑکھڑا کر زینے سے گر پڑے۔ 1963 میں پتہ چلا کہ انھیں اے ایل ایس Amyotrophic Lateral Sclerosis کی بیماری ہے جسے motor neurone disease بھی کہتے ہیں۔ اس وقت ولیم کی عمر 21 سال تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ صرف دو سال جئیں گے۔ لیکن وہ ابھی تک زندہ ہیں اگرچہ ان کے دماغ دل اور آنکھوں کو چھوڑ کر باقی تقریباً سارا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ دائیں گال کا ذرا سا حصہ ہی ان کی مرضی سے پھڑک سکتا ہے۔ اس حصے کو چھونے والا ایک سینسر Sensor ان کی بات کو آواز میں بدل دیتا ہے جس سے ان کی بات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ 2007 میں انھوں نے خلائی سفر میں لوگوں کی دل چسپی جگانے کے لیے امریکہ کی زیرو گریوٹی کارپوریشن کے جہاز 'وومٹ کومیٹ' Vomit Comet میں کیے گئے پروگرام میں حصہ لیا۔ اس جہاز میں تقریباً بے وزنی کا ماحول رہتا ہے جسے خلائی مسافر زمین کی کشش سے باہر نکل کر محسوس کرتے ہیں اور اس میں خلابازوں کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ ن ظ

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر طاہر نے بیٹے سے پوچھا۔

''میں کائنات کے راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔'' ندیم نے اپنا ارادہ بتایا۔

ندیم میں تبدیلی یہ آئی کہ وہ سارا وقت پڑھنے لکھنے میں گزارنے لگا۔ ابھی ندیم کی تعلیم پوری نہیں ہوئی تھی اس کی صحت بگڑنے لگی۔ حالانکہ ندیم ابھی خود اپنے سہارے سے لیٹتا، بیٹھتا اور اپنے ہاتھوں سے کھاتا تھا لیکن دھیرے دھیرے اس کا جسم ہی نہیں بلکہ اس کی آواز بھی جواب دینے لگی۔ زیبا نے ندیم کے ایک ساتھی کو اس کا خیال رکھنے کے لیے کام پر رکھ لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی رہی کہ ندیم کی بات صرف وہی لوگ سمجھ پاتے تھے جو زیادہ تر اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوں۔ ورنہ ندیم کی بات کسی کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ کچھ دنوں بعد ندیم کے گلے کا آپریشن ہوا، لیکن اس کے ساتھ ندیم کی آواز بھی ختم ہوگئی۔

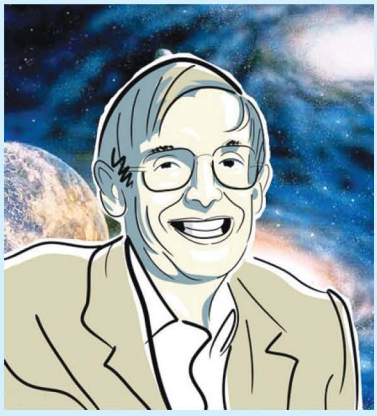

ندیم اپنی محنت اور کام کی وجہ سے مشہور ہونے لگا۔ اس کی حالت کی خبر بھی لوگوں تک پہنچنے لگی۔ دھیرے دھیرے ندیم کے ہاتھ پیروں نے بھی جواب دے دیا۔ وہ اب بستر یا وہیل چیر پر ہی پڑا رہ سکتا تھا۔ یہ معلوم ہونے پر کمپیوٹر کے ایک ماہر نے ندیم کی مدد کی۔

''اب تم نہ بول سکتے ہو اور نہ ہی ہاتھ پیر ہلا پاؤ گے، لیکن میں تمہارے بولنے کا مسئلہ حل کرسکتا ہوں۔ تم اپنے سر یا آنکھ کے اشاروں سے اس مشین کے ذریعہ باتیں کرسکو گے۔ پھر تم اپنا کام کرتے رہ سکتے ہو جو بہت اہم ہے۔''

ندیم کمپیوٹر کے اس خاص پروگرام کی وجہ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مشین کی آواز ہوتی ہے جس کے ذریعے ندیم باتیں کرتا ہے۔ ورنہ اس کے جسم میں صرف دماغ ہی کام کر رہا تھا۔ اس کی اپنی مرضی سے۔ ندیم کی ریسرچ لگاتار شائع ہوتی رہی۔ اس نے خلا میں ایک ہول Hole کے بارے میں راز سے پردہ اٹھایا اور دنیا چونک گئی۔

ایک دن ندیم کو یونیورسٹی میں بہت ہی اعلیٰ رتبہ کا پروفیسر بنادیا گیا۔ اس کے بعد تو ندیم کو ایک کے بعد ایک اعزاز سے نوازا گیا۔ دوسرے ملکوں سے بھی اعزاز ملنے لگے۔ ایک مرتبہ اس نے کہا ''مجھے خلا میں سفر کا تجربہ کرنا ہے، کیونکہ انسانوں کو بالآخر خلا میں ہی پناہ ڈھونڈنی ہوگی۔'' اپنی جسمانی معذوری کے باوجود ندیم نے خلا کا تجربہ کیا، ایک خلائی جہاز میں۔

ندیم جس خاص کمپیوٹر پروگرام کے ذریعہ اپنے گال کی رگ کے اشاروں سے باتیں کرتا ہے اس کے بارے میں اس نے ایک نئی بات کہی جسے سن کر دنیا حیران رہ گئی۔ ''مصنوعی ذہانت دنیا کا سب سے بڑا انقلاب ثابت ہوگا۔ اس کے ذریعہ مالی بازار، ریسرچ، رہنما، اور بربادی کے ہتھیار ایسے وجود میں آئیں گے جنھیں سمجھنا انسانی ذہانت اور انسانوں کے بس کی بات نہیں ہوگی۔'' اس کے ساتھ ندیم نے یہ پیشین گوئی کی ''یہی دنیا کا آخری انقلاب ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے خطروں کو پہچانا نہیں گیا۔''

بچوں کیا تم تعلیم حاصل کرکے دنیا کو ان تکنیکی خطروں سے نہیں بچاؤ گے۔ آپ کے لیے یہ کہانی ہم نے دراصل پروفیسر اسٹیفن ولیم ہاکنگ Prof Stephen William Hawking کی زندگی سے متاثر ہوکر لکھی ہے جو دنیا کے عظیم ترین مفکروں اور سائنس دانوں میں گنے جاتے ہیں۔ ہاکنگ کی زندگی اور کارنامے بے مثال جرات مندی اور انسان کے بلند ترین حوصلوں کی انوکھی مثال ہیں۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد بہت اچھا ہوگا اگر تم پروفیسر ہاکنگ کی زندگی کے بارے میں ہی نہیں بلکہ ان کے خیالات کے بارے میں بھی پڑھو، اور ان کی ہی طرح اس کائنات کو خود سمجھنے اور جاننے کی کوشش میں اپنا دل لگاؤ! □

Prof Idris Siddiqui
40, Whiteleas Avenue Scarborough ON MIBIW 7, CANADA

سائنس کی کہانیاں

سکٹف اینڈ سکٹف **مترجم**: انیس الدین ملک / **نظر ثانی**: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

قصّہ ایک عظیم سائنس داں کا

انتوئن لاریں دی لوائزر Antoine-Laurent de Lavoisier ایک مالدار فرانسیسی کا بیٹا تھا۔ وہ 1743 میں پیدا ہوا۔ کم عمر سے ہی وہ پڑھنے لکھنے میں سب سے آگے نکل گیا تھا۔ خاص طور سے اس کو سائنس میں بہت دلچسپی تھی جو اس زمانے میں نئے طالب علموں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔ اس نے اپنے پیسوں سے سائنسی تجربوں کے لیے ضروری چیزیں خرید لیں اور جلد ہی اس کی گنتی اس وقت کے بڑے سائنس دانوں میں ہونے لگی۔

1767 میں فرانس کی زمین کا رقبہ ناپنے کے بعد اسے 25 سال کی جواں عمر میں فرانس کی 'شاہی سائنسی اکادمی' کا ممبر چن لیا گیا۔

لیکن اس کے کام اس بڑے اعزاز سے کہیں زیادہ اونچے درجے کے تھے۔ اس نے اس زمانے میں جلنے Combustion کے بارے میں دیے جانے والے نظریے کو جھٹلا دیا اور ایک صحیح ترازو بنانے میں مدد کی جو تمام سائنسی تحقیقات میں معاون ثابت ہوا۔ چونکہ یہ کہانی اپنے ملک کے حکمرانوں سے لوائزر کے تعلقات کے بارے میں ہے اس لیے خاص طور سے ان کاموں کا ذکر کیا جائے گا جو اس نے حکومت کے لیے کیے تھے۔

1775 میں اسے بارود کے سرکاری کارخانے کا افسرِ اعلیٰ یعنی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ 'بارود کمشنر' ہونے کی حیثیت سے اس نے بارود کی دھماکہ خیز طاقت کو بڑھانے کے کئی طریقے ایجاد کیے۔ اس نے پیمائش کے لیے نیا نظام بنا کر اور سائنس کا زراعت میں استعمال کر کے قوم کی زبردست خدمت کی۔ جب انقلاب آیا تو انقلابی لیڈروں نے بھی اس کی مدد لی اور اس سے نوٹ چھاپنے کا ایسا کاغذ تیار کرنے کے لیے صلاح مانگی جس کی آسانی سے نقل نہ کی جاسکے۔

انقلاب سے پہلے تمباکو اور نمکین چیزوں پر ٹیکس اور کسٹم کی

زندگی کے لیے سب سے ضروری مانی جانے والی گیسیں، آکسیجن اور ہائڈروجن کروڑوں اربوں سال سے ہماری ہوا میں موجود ہیں لیکن ان گیسوں کا پتہ سب سے پہلے فرانسیسی سائنس داں انتوئن لوائزر نے اب سے صرف 232سال پہلے لگایا تھا اور دنیا کو بتایا تھا کہ چیزوں کے جلنے کے عمل Combustion اور زندگی کے جاری رہنے میں ان گیسوں کی کیا اہمیت ہے۔ویسے کارل ولہیم شیل اورجوزف پریسٹلے بھی اس پر کام کر رہے تھے۔ لوائزر دنیا کے اہم ترین کیمیا دانو ں اور کیمیا کے ماہروں میں گنا جاتا ہے جنھوں نے علمِ کیمیاChemistry کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ چیزوں کی پیمائش، یعنی انھیں ناپنے کا سب سے آسان نظام System بھی اسی نے تیّار کیا جو ایک اور صفر کے ہندسوں پر مبنیBasedہے اور جسے آج اعشاری نظامMetric System کے نام سے جانا جاتا ہے۔ہمارے لیے اس میں فخر کی بات یہ ہے کہ علمِ ریاضیMathmeticsکو صفر پر مبنی اعشاری حساب ہندوستان کی دین ہے۔لوائزر ایک دولت مند شخص تھا ، اس کی بیوی میری این پیئرے پاز Marie-Anne Pierrette Paulze بھی ایک دولت مند شخص کی بیٹی تھی جس نے بہت سے اہم سائنسدانوں کے مضامین کا انگریزی سے فرانسیسی میں ترجمہ کرکے شوہر کا ہاتھ بٹایا تھا۔ لوائزر نے اپنی سائنسی دریافتوں اور ایجادات کی بدولت زندگی میں ہی بہت بڑے اعزاز بھی حاصل کیے تھے لیکن اس کی موت زبردست توہین کے حالات میں ہوئی جس کا ذکر اس مضمون میں آئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس اور سائنس دانوں کے سچّے واقعات الف لیلہ کی فرضی کہانیوں سے کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔ن ظ

وصولی کا کام مالدار سرمایہ داروں کی ایک جماعت کے سپرد کیا گیا تھا جنھیں جنرل فارمرس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ سرکار کو سالانہ ایک خاص رقم ادا کیا کرتے تھےلیکن باقی بچی رقم آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ لوائزر بھی ٹیکس فارمر بن گیا اور اپنی قابلیت کی بنا پر اس تنظیم کا ایک خاص رکن یعنی ممبر چن لیا گیا۔ اس نے جلد ہی بہت سی دولت جمع کر لی۔

ٹیکس وصول کرنے والے کبھی بھی اور کسی بھی ملک میں پسند نہیں کیے گئے۔لیکن فرانس میں ٹیکس فارمرس کو خاص طور سے ناپسند کیا جاتا تھا۔ان کا خاص مقصد تھا ٹیکس کے قانون پر بڑی سختی سے عمل کرانا۔ ٹیکس سے بچنے والوں اور اسمگلروں کو، خاص طور سے نمک کے اسمگلروں کو، جنھیں کافی ٹیکس دینا پڑتا تھا، سخت سزا ملتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تنظیم کے کام کاج کے بارے میں کئی شرمناک واقعے مشہور ہوئے۔ خاص طور سے وہ واقعات جن سے یہ راز کھلا کہ ٹیکس فارمرس نے معزز اور پُر اثر لوگوں کو ناجائز رقمیں ادا کیں اور بادشاہ اور

اس کی بیگموں کو ہر سال بڑی رقمیں رشوت کے طور پر دی گئیں۔

اس سے فرانسیسیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ چنانچہ انقلاب کے دو سال بعد 1791 میں نیشنل اسمبلی نے ٹیکس فارم بند کر دیا اور ٹیکس فارمرس سے دو سال کے اندر اپنا حساب کتاب ختم کرنے کو کہا۔ لیکن ٹیکس فارمرس نے یہ کام بہت آہستہ آہستہ کیا اور دیے گئے وقت میں کوئی حساب دینے میں ناکامیاب رہے۔ بے وجہ کی اس دیر اور دوسری کئی وجہوں سے یہ لوگ اور بھی ناپسند کیے جانے لگے او رنومبر 1793 میں تو ایک لیڈر نے یہ مطالبہ کر ڈالا کہ ان 'خون چوسنے' والوں کو فوراً گرفتار کیا جائے۔ قانون کے مطابق تمام ٹیکس فارمرس کو گرفتار کر لیا گیا جن میں لوائزر بھی شامل تھا۔

قیدیوں کو مئی 1794 تک مقدمے کا انتظار کرنا پڑا اور اس کے بعد ان کو انقلابی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ دستور کے مطابق پہلے انفرادی پوچھ تاچھ ہوئی پھر ان کا مقدمہ شروع ہوا۔ ججوں کا صدر کوفن ہال نام کا ایک شخص تھا جو اپنے سامنے آئے ہوئے مجرموں سے طنزیہ جملے بازی اور مذاق کرنے کے لیے مشہور تھا۔ فارمرس پر تمام قسم کی بدعنوانی اور غبن کرنے کے سنگین الزامات تھے۔ اس کے علاوہ ان پر ضمانت ناموں پر مقررہ رقم سے زیادہ سود لینے، جو رقم حکومت کے خزانے میں جمع ہو جانی چاہئے تھی اسے اپنے پاس رکھنے اور تمبا کو میں پانی اور دوسری چیزوں کی ملاوٹ کے بھی الزامات تھے جو عام شہریوں کی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ آخری الزام من گھڑت تھا کیونکہ سرکاری پیروکار کو معلوم تھا کہ تمبا کو بنانے کے دوران تمبا کو کی پتیوں میں کچھ پانی ضرور ملایا جاتا ہے، اور ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس میں ضرورت سے زیادہ پانی ملایا گیا یا صحت کے

اوپر دائیں لوائزر کا پورٹریٹ، نیچے اس کی تجربہ گاہ اور پچھلے صفحے پر باکس میں لوائزر اور اس کی بیوی میری کا پورٹریٹ

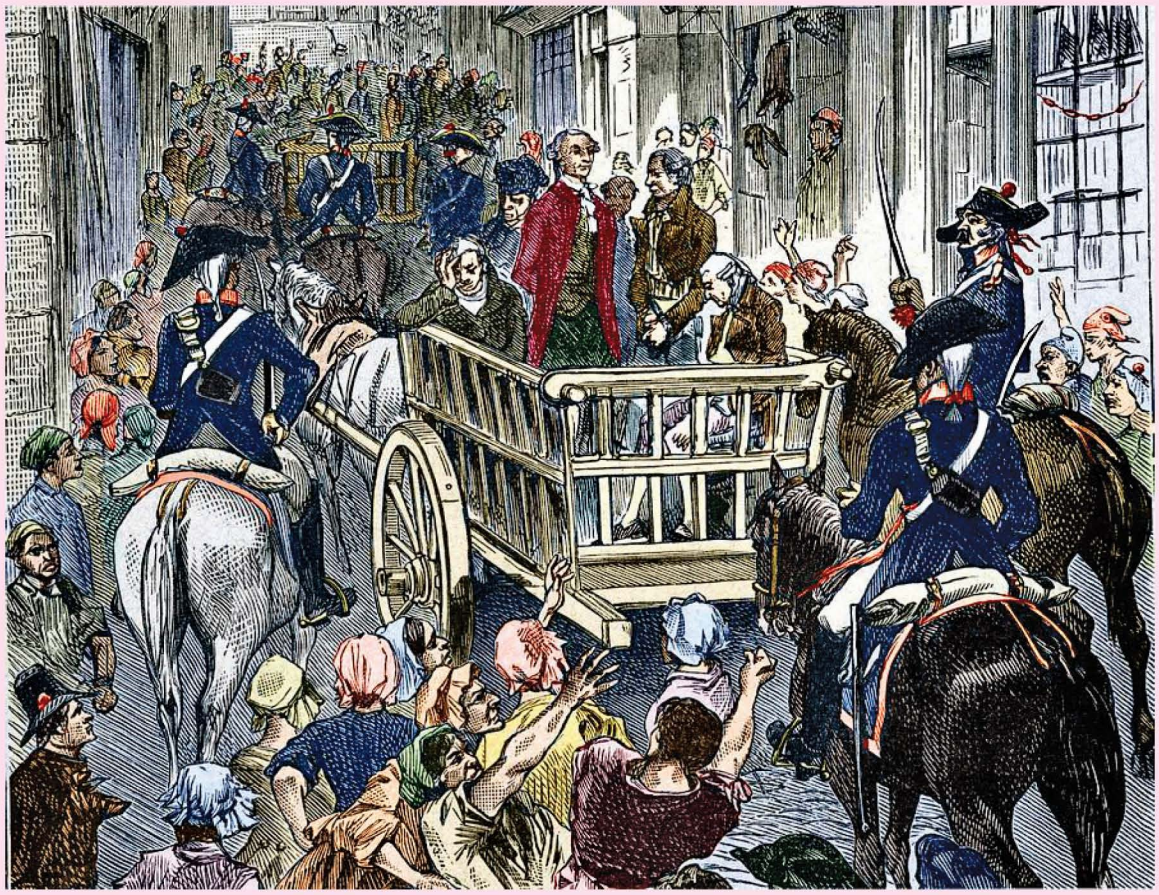

8 مئی 1794 کو لوائزر کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس سے پہلے اسے پیرس کی گلیوں سے 'موت گھر' لے جائے جانے کا منظر مصور کی نظر میں

لیے کوئی نقصان دہ چیز ملائی گئی تھی۔

لوائزر اور بیشتر ٹیکس فارمرس کو موت کی سزا سنائی گئی اور اس زمانے کے دستور کے مطابق سزا کی کارروائی سزا سنانے کے چند لمحوں کے اندر پوری کر دی گئی۔ مقدمے کے درمیان اس بات کی کوشش کی گئی کہ لوائزر کی عظیم سائنسی خدمات کو جو اس نے فرانس کے لیے کی تھیں، فراموش نہ کیا جائے۔ لیکن یہ کوشش بے سود رہی۔ لوائزر یا اس کی جانب سے کسی شخص نے یہ بھی درخواست کی کہ سزا کو پندرہ دنوں کے لیے ٹال دیا جائے تاکہ لوائزر اپنے چند ضروری تجربات مکمل کر سکے۔ مقدمہ کے اس موقع پر جج کوفن ہال نے ایک نہایت شرارت انگیز جملہ کہا ''جمہوریت کو سائنس دانوں کی ضرورت نہیں ہے اور انصاف کو اپنا تقاضا پورا کرنا چاہیے۔''

لوائزر کی موت سے دانشوروں کے طبقے کو گہرا دھکا لگا۔ کارلائل لکھتا ہے ''موسم بہار نے سبز پتیاں، خوشگوار موسم اور خوشبودار مٹی بھیجی لیکن موت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مشہور ماہر کیمیا لوائزر اب زندہ نہیں رہے گا بلکہ مر جائے گا۔ کیمیا داں لوائزر 'فارمر جنرل لوآئزر' بھی تھا اور اب تمام فارمر جنرلس کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سب اپنے پیسے اور آمدنی کا حساب نہ دینے اور تمبا کو میں پانی ملا کر بیچنے پر مارے جائیں گے۔ لوائزر نے پندرہ دن زندگی کی مہلت مانگی تاکہ وہ کچھ تجربات ختم کر سکے لیکن جمہوریت کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کلہاڑی اپنا کام کرے گی۔''

لوائزر کو خوف و ہراس کے اس دورِ حکومت کے ختم ہونے سے چند مہینے پہلے سزائے موت ملی۔ جب یہ دور ختم ہوا تو جج کوفن ہال اور دوسرے اہم انقلابیوں کو سولی کا شکار بننا پڑا۔ رفتہ رفتہ فرانس کے حالات ایسے ہوگئے کہ وہاں کے باشندے اور دوسرے سائنس داں بے خوف ہوکر کھلے الفاظ میں لوائزر کی موت پر اظہارِ افسوس کرنے لگے۔ اس وقت مشہور فرانسیسی سائنس داں لیگرینج نے یہ مشہور الفاظ کہے ''اس کا سر جدا ہونے میں صرف ایک لمحہ لگا لیکن سو سال بھی اس جیسا سائنس داں پیدا ہونے کے لیے شاید ناکافی ہوں گے۔''

12 اگست 1796 کو لائی سی ڈیس آرٹس میں لوائز کے اعزاز میں ایک یادگار نشست ہوئی۔ لائی سی کے سالانہ کلینڈر میں اس رسم کی تفصیل مرقوم ہے۔ یہ رسم اس زمانے کے شایانِ شان تھی۔ کلینڈر میں درج تحریر کے مطابق:

لائی سی میں داخل ہوتے ہی راستہ ایک بڑے سے انڈر گراؤنڈ ہال کو جاتا تھا جس کے اوپر لکھا تھا 'لافانی لوائز کی طرف'۔ شروع کے کمروں میں پھولوں، ہاروں اور سبز پتیوں سے ڈھکے ہوئے والٹیر اور روسو کے مقبروں کے نقش ثانی رکھے ہوئے تھے۔

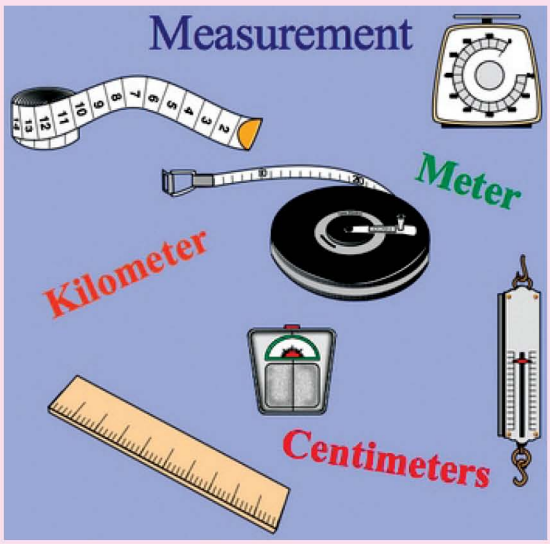

سیڑھیوں کے سامنے 25 فٹ اونچا حرم بنا ہوا تھا جو جلد ہی کاٹے گئے سفیدے کے اونچے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس کا سنگ مرمر کا ڈھانچہ جنازے کی محراب کی شکل میں تھا جس پر لکھا ہوا تھا 'مرنے والے کے اعزاز میں'۔

ہال میں تین ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ یہ سیاہ کپڑوں سے آراستہ تھا جس پر سلمہ ستاروں کا کام بنا ہوا تھا اور ہال بیس ماتمی شمعوں سے روشن ہو رہا تھا۔ ہر ستون پر ایک ڈھال ٹنگی ہوئی تھی جس پر لوائزر کی دریافت کا عنوان لکھا ہوا تھا۔ ہال کے پیچھے جہاں دونوں طرف ڈی سالٹ اور وکڈیسر کے مقبروں کے نقش ثانی تھے، ڈیوک کی پوشاک سے ملتا جلتا ایک بڑا سا پردہ ٹنگا ہوا تھا۔

سامعین بڑی تعداد میں موجود تھے، مرد کالے لباس پہنے تھے اور خواتین سفید لباس میں تھیں، اور سب کے سروں پہ گلاب کا ایک چھوٹا سا تاج تھا۔ اس رسم کے پروگرام میں مشہور سائنسداں فورکروے نے تقریر کے ذریعے مرنے والے کو خراجِ عقیدت پیش کیا جو دراصل لوائزر کی مدح سرائی تھی اور جس میں روح کے لافانی ہونے پر چند شعر کہے گئے تھے۔ پروگرام کے آخیر میں ایک المیہ گایا گیا جو خاص طور سے اس تقریب کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسے گانے کے لیے کمرے کے آخری حصے میں لٹکے ہوئے پردے کو کھینچا گیا۔ پردہ کھینچتے ہی ایک سو گانے والوں کے ساتھ خاص مرثیہ گو حاضر ہوئے جو لوائزر کے مقبرے کے چاروں طرف نظر آئے، اور اس کے مجسمے کو آزادی کا تاج پہنا رہے تھے۔ نغمہ ان مصرعوں کے ساتھ ختم ہوا۔

''اس غیر معمولی ذہانت کے انسان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اس کی تعظیم میں ایک یادگار قائم کی جائے۔''

پھر ایک حرم نمودار ہوا جس پر لوائزر کا بت بنا ہوا تھا اور جس کے سر پر شہرت کا لافانی تاج تھا۔ وہ تاج جس سے رسم و رواج کے مطابق غیر معمولی ذہین لوگوں کو ہی نوازا جاتا تھا۔

اب تک سائنس دانوں کی یاد میں ہونے والی تقریبوں میں یہ سب سے زیادہ شاندار تھی □

قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتاب 'سائنس کی کہانیاں' جلد اول، سے ماخوذ

مضمون

□ راشد جمال فاروقی

ٹیلی فون کا سفر

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ اس چیز کا نام بتایئے جو آج تقریباً ہر انسان کے پاس پائی جاتی ہے تو آپ کوئی وقت گنوائے بغیر فوراً کہہ دیں گے، ''موبائل فون'' اور آپ کا جواب بالکل صحیح ہوگا۔

موبائل فون کے بغیر آج ہم خود کو بے بس اور لاچار سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی محال ہے۔ کیونکہ ہمارا موبائل فون ہمیں صرف پیغام سننے اور پہنچانے کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ اب ہمیں نہ تو ڈائری اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے نہ گھڑی۔ یہ ہمارا کلینڈر بھی ہے، کیلکولیٹر بھی، ریڈیو بھی، کیمرہ بھی، ٹی وی بھی اور اب تو انٹرنیٹ نے تمام دنیا ہمارے سیل فون پر سجادی ہے۔ ہم یہاں فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ اخبار و رسائل پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے خط بھیج سکتے ہیں دوسروں کے خط پڑھ سکتے ہیں۔ صبح سویرے الارم کے ساتھ یہ ہمیں جگاتا ہے اور دن بھر ہمارے ساتھ رہنے کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔

▲ قدیم ترین پبلک فون اور اوپر ایک پرانا ٹیلی فون

بچو! موبائل فون سے پہلے لینڈ لائن فون ہوا کرتے تھے۔ اب بھی اکثر گھروں اور دفتروں میں آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارا موبائل فون دراصل اسی لینڈ لائن ٹیلی فون کی سدھری ہوئی شکل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لینڈ لائن فون کے ساتھ تار کا کنکشن ہوتا ہے اور موبائل بغیر تار کے کام کرتا ہے۔ ویسے اب لینڈ لائن فون بنا تار کے بھی کام کرنے لگے ہیں جو ایک طرح کے وائر لیس سیٹ ہوتے ہیں۔ ویسے موبائل فون بھی ایک وائر لیس سیٹ ہی ہے۔ چنانچہ دیکھیں تو موبائل سیٹ یا وائر لیس لینڈ لائن سیٹ کل ملا کر ٹیلی فون اور وائر لیس سیٹ کے میل سے

سیموئل مورس

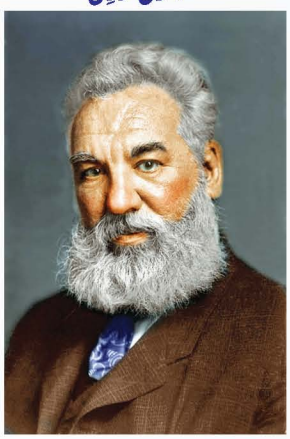

الیگزینڈر گراہم بیل

وجود میں آیا ہے اور اگر ٹیلی فون اور وائرلیس یا ریڈیو سیٹ ایجاد نہ ہوتے تو آج موبائل فون بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح ٹیلی فون کو دیکھا جائے تو وہ ٹیلی گراف کی بدولت وجود میں آیا۔ اس سے بات یہ سامنے آتی ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر نئی ایجاد کا سلسلہ کسی پرانی ایجاد سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی یہ نہ ہوتا اگر وہ نہ ہوتا، اور وہ بھی نہ ہوتا اگر اسے پہلے کا وہ نہ ہوتا۔ ہے نہ کچھ گول مول سی بات!

موبائل کے سلسلے کو سیدھا کردیں تو کہنا ہوگا کہ کم وولٹیج کی بیٹری والی بجلی ایجاد نہ ہوتی تو ٹیلی گراف نہ ہوتا۔ ٹیلی گراف ایجاد نہ ہوتا تو لینڈ لائن ٹیلی فون کی ایجاد نہیں ہوئی ہوتی۔ لینڈ لائن فون نہ بنتا تو وائرلیس کی ضرورت نہ پیش آتی اور یوں عام موبائل فون نہ بن پاتا تو آپ کے ہاتھ میں آج یہ اسمارٹ فون بھی کہاں ہوتا۔ اب آیئے ذرا ٹیلی فون کے جنم کی کہانی پر نظر ڈالتے ہیں۔

اوپر کی باتیں پڑھ کر یہ تو آپ جان ہی گئے ہیں کہ دنیا کی ہر ایجاد سے پہلے بہت سے سائنس دانوں کی محنت کچھ ناممکن چیزوں کو ممکن بناتی ہے تبھی آگے کا سفر جاری ہو پاتا ہے۔ ٹیلی فون کی ایجاد سے قبل تار برقی یا ٹیلی گراف کی ایجاد ہوئی۔ برقی رو اور برقی مقناطیس کی دریافت کے بعد نقطے اور ڈیش کی شکل میں پیغام رسانی کا کام ایک امریکی سائنس داں سیموئل فنِ لے بریز مورس Samuel Finley Breese Morse نے ممکن کر دکھایا۔ یہ کارگر ایجاد برسوں انسان کی خدمت کرتی رہی اور آخر کار اب اسے غیر ضروری تسلیم کر کے اس کا استعمال روک دیا گیا ہے۔ لیکن ایک وقت تھا کہ تار برقی کے ذریعہ

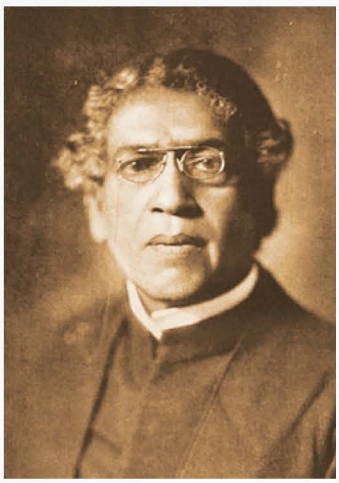

سر جگدیش چندر بوس

ہمارے بڑے، بہت کم وقت میں پیغام پہنچانے اور حاصل کرنے کا کام آسانی سے کر پاتے تھے۔ ہندوستان کی 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کی جیت میں ٹیلی گراف کا بھی ہاتھ تھا۔ 'تار' کی ایجاد کے بعد سائنس دانوں نے اگلے قدم کی طرف توجہ دی۔ تار کے ذریعہ تو ہم اپنی بات نقطوں اور لکیروں کے اشارہ سے پہنچاتے تھے۔ اب کوشش شروع کر دی گئی کہ انسانی آواز کو ہی جوں کا توں ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچایا جائے۔

اسکاٹ لینڈ کا باشندہ الیگزینڈر گراہم بیل گونگے بہرے بچوں کو انگلینڈ میں تعلیم دیا کرتا تھا۔ بعد میں وہ کناڈا گیا اور پھر امریکہ جا پہنچا۔ امریکہ کے بوسٹن شہر میں اس نے ایک گونگے بہرے بچوں کے اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ وہیں اپنی ایک شاگرد بیل ہیوبرڈ سے اس نے

ایک چھوٹی سی ٹیلی گراف مشین

شادی کرلی۔ اس کا سُسر بہت مالدار آدمی تھا۔ لہٰذا اسے روپے پیسے کی فکر نہ رہی اور وہ سائنسی تجربات میں دن رات غرق رہنے لگا۔ واشنگٹن میں اسے جوزف ہنری ملا جو بجلی کا ماہر تھا۔ گراہم بیل نے جوزف ہنری سے بجلی کی پوری معلومات حاصل کی جو اس کے تجربات میں کام آنے والی تھی۔

جوزف ہنری نے جب گراہم بیل کا منصوبہ سنا اور اس کی لگن اور ذہانت دیکھی تو اسے یقین ہوگیا کہ گراہم بیل اپنے منصوبے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

▲ اوپر ایک پرانا ریڈیو اور نیچے ایک وائرلیس سیٹ ◀

جوزف ہنری نے گراہم بیل کی ہمت افزائی کی۔ اب گراہم بیل دنیا جہان سے غافل ہوکر صرف اپنے مشن میں لگ گیا۔ اس کے ایک معاون تھامس واٹسن نے بھی اس کا پورا ساتھ دیا۔ آخر کار 1876 میں یہ دونوں پہلا ٹیلی فون بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ 10 مارچ 1876 کو گراہم بیل نے بولنے کا آلہ اپنے منہ کے پاس لگا کر عمارت کی دوسری منزل سے اپنے اسسٹنٹ تھامس واٹسن کو بلایا۔ واٹسن عمارت کی نچلی منزل میں تھا اور اس کے کان پر سننے کا آلہ لگا ہوا تھا۔ گراہم بیل

نے کہا ''واٹسن پلیز یہاں آؤ، تم سے کچھ کام ہے۔'' اور واٹسن اوپر پہنچ گیا۔ ظاہر تھا کہ ٹیلی فون نے اپنا کام ٹھیک طرح کر دیا تھا۔ لیکن جب گراہم بیل پٹینٹ دفتر میں اپنی ایجاد کے بارے میں بتانے پہنچا تو ایک اور شخص بھی وہاں اسی ایجاد کا دعوے دار آ پہنچا۔ لیکن چھان بین کرنے سے معلوم ہوگیا کہ اس عجیب وغریب ایجاد کا سہرا گراہم بیل کے سر ہی بندھا تھا۔ گراہم کی مصیبتیں یہیں ختم نہیں ہوئیں، اس کی ایجاد پر لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ تو اچھا یہ ہوا کہ برازیل کے شہنشاہ پیڈرو نے گراہم بیل کی ایجاد کو دیکھا پرکھا اور استعمال کر کے حیرت زدہ رہ گیا۔ تب جا کر لوگوں نے گراہم بیل کی محنت کو پہچانا، اور ٹیلی فون کی مانگ دن بدن زور پکڑتی گئی۔

▲ اوپر موبائل فون کی ترقی کا سفر، نیچے مارٹن کوپر اپنی ایجاد کے ساتھ 2007 میں فوٹو کھنچواتے ہوئے ◀

گراہم بیل نے اپنے ٹیلی فون پر واٹسن سے جو پہلا جملہ بولا تھا ''واٹسن پلیز یہاں آؤ، تم سے کچھ کام ہے'' وہی تاریخی جملہ اس نے واٹسن سے 39 برس بعد 1915 میں پھر ٹیلی فون پر دوہرایا۔ دراصل امریکہ میں مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک ایک بہت لمبی ٹیلی فون لائن بچھائی گئی تھی۔ 3400 میل کے فاصلے پر واٹسن نے پھر یہی جملہ گراہم بیل سے سنا مگر اس بار اس نے کہا ''جناب میں ایک ہفتے میں آپ کے پاس پہنچ سکوں گا۔''

موبائل فون کے وجود کو ممکن بنانے والی سب سے اہم ایجاد ریڈیو اور وائرلیس کو بنانے کے لیے کئی سائنس داں مل جل کر یا اپنے طور پر یہاں وہاں کام کر رہے تھے۔ مگر ایجاد کا سہرا اٹلی کے گگلیمو مارکونی Guglielmo

Marconi کے سر بندھا۔ جسے اس کے لیے نوبیل انعام بھی ملا۔ لیکن اب ثابت ہوا ہے کہ ہندوستان کے مشہور سائنس داں سر جگدیش چندر بوس پہلے ہی مارکونی والا وائر لیس رسیور ایجاد کر چکے تھے۔ مگر انھیں یہ اعزاز نہیں دیا گیا حالانکہ آج بھی انھیں ریڈیائی لہروں کی سائنس کا عظیم ماہر مانا جاتا ہے۔

بہر حال، ریڈیو کی ایجاد کے تقریباً سو سال بعد ایک امریکی انجینیر سائنس داں مارٹن کوپر نے 1973 میں ایک ایسا سیلولر موبائل فون بنالیا جسے ہاتھ میں لے کر ساتھ لے جایا جا سکتا تھا اور سفر میں یا قیام میں اس پر کسی سے بات کی جاسکتی تھی۔ 3 اپریل 1973 کو اس نے ایک سیلولر فون پر کئی جگہ موجود لوگوں کے ساتھ پریس کانفرنس کر کے راہگیروں کو حیران کر دیا۔ اگرچہ یہ ہاتھ میں رکھنے والا موبائل فون تھا پھر بھی خاصا بڑا تھا۔ 1983 میں اسے مارکیٹ میں عام استعمال کے لیے لایا گیا جس کے بعد اس ایجاد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

چھلانگیں لگاتا ہوا موبائل فون آج کے دور تک آ پہنچا، جب اس کی آبادی تقریباً پوری دنیا کی آبادی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ سائز اور وزن اتنا کم کہ ہتھیلی میں سما جائے۔ فنکشن اتنے کہ ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس سے آپ بنک کے کھاتوں سے رقم ٹرانسفر کر سکتے ہیں، کہیں بھی جاتے ہوئے یہ آپ کی منزل کا سب سے چھوٹا راستہ بتا دیتا ہے، آپ کی نبض اور دل کی دھڑکن کی رفتار، بلڈ پریشر اور جسم کا درجہ حرارت بھی اس سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اب موبائل فون آپ کے تمام ریموٹ کنٹرولز کی جگہ بھی لینے والا ہے، اور پاسپورٹ کی جگہ بھی یہی استعمال ہوا کرے گا۔ جہاں تک ٹیکنالوجی کا تعلق ہے تو موبائل فون ہینڈ سیٹ جس تیزی سے ہر سال بدل رہیں وہ تیزی ٹیکنالوجی کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ہمارے ملک میں خریدے گئے موبائل فونز کی تعداد ہماری آبادی سے بھی کہیں زیادہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ لوگ جلدی جلدی اپنے موبائل سیٹ بدلتے رہتے ہیں اور اب موبائل صرف ضرورت کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک فیشن ہے جو بدلتا رہتا ہے۔

اس سب کا مطلب صرف ایک ہے۔ آنے والے دنوں میں موبائل نمبر اور موبائل ہینڈ سیٹ دونوں آپ کی واحد پہچان بن جانے والے ہیں۔ تیار رہیے! □

سب سے اوپر آج کل کے اور نیچے مستقبل (2020) کے موبائل فون

Rashid Jamal Farooqui
C-1452, IDPL Township, Virbhadra
Rishikesh Dehradun - 2449202 Uttarakhand

مضمون

محمد قیوم میو

جنگل میں مور ناچا
کوئل نے گیت سنائے

برسات کے موسم میں پَر پھیلائے ناچتے ہوئے موروں کو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ اسی طرح باغوں میں گیت گاتی کوئل کی مدھر آواز بھی آپ نے یقیناً سنی ہوگی۔ تو پھر چلیے آج ہم آپ کو رقص و موسیقی یعنی ناچ گانے سے جانوروں کی دل چسپی کے بارے میں کچھ دل چسپ باتیں بتاتے ہیں۔

مور وہ پرندہ ہے جیسے دیکھ کر ہر کسی کا دل جھوم اٹھتا ہے۔ ریل سے سفر کے دوران سرسبز جنگلوں اور کھیتوں سے گزرتے ہوئے اور چڑیا گھروں میں آپ نے مور ناچ کا دلکش نظارہ ضرور دیکھا ہوگا۔ پتلی صراحی دار گردن والا یہ پرندہ بنیادی طور پر خالص ہندوستانی ہے اور اسے آسانی سے پالتو بنایا جاسکتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ موریہ خاندان کا نام مور سے ہی پڑا ہے۔ سوریہ ونش سمراٹوں کی رسوئی میں روزانہ مور پکائے جاتے تھے، لیکن شہنشاہ اشوک کو یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے اس رواج کو یکسر ختم کروادیا۔ موریہ دور کے سکوں پر مور کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ مغل بادشاہ جہانگیر اور شاہ جہاں کو بھی مور بے حد پسند تھے۔ شاہ جہاں نے جو تخت طاؤس بنوایا تھا اس کی شکل مور جیسی تھی۔ تاریخ کی طرح مذہبی حلقوں میں بھی مور کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ کہتے ہیں ماں سرسوتی کو بھی یہ پرندہ بہت پیارا تھا۔ کرشن جی مہاراج کے تاج میں مور کے پنکھ ہونے کی وجہ سے ہی انھیں مور مکٹ (مور کا تاج) کہا جاتا ہے ہمارے یہاں مور کی چھ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ہریانہ،

راجستھان اور خاص کر چتر کوٹ اور ورندابن میں یہ کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ گھنے جنگلوں کے علاوہ یہ میدانی علاقوں میں بھی ملتے ہیں۔ چونکہ انھیں گرمی اور پیاس کا احساس شدت سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے مور ندی کے کنارے رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ برفانی علاقے اسے بالکل پسند نہیں ہیں۔ مور سب کچھ کھالیتا ہے، پھل، پھول، بیج، گھاس، پتی وغیرہ تو یہ کھا ہی لیتا ہے اس کے ساتھ ہی چھوٹے موٹے سانپ اور چوہے بھی کھا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ جہاں مور ہوتا ہے اور جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے، وہاں تک سانپ نہیں آتا۔ مور کاشتکاروں کا اچھا اور بہترین دوست ہے۔ یہ کیڑے مکوڑوں کو کھا جاتا ہے۔ جس سے فصلوں کو نقصان نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے علاوہ مور، افریقہ، برما، جاوا، پاکستان، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں بھی ملتا ہے۔

یوروپ میں مور کی آمد سکندر اعظم کے ذریعہ ہوئی تھی۔ مور کا جسم بہت بڑا اور اس کی آواز بڑی کرخت ہوتی ہے، اور صبح سے ہی سنائی دینے لگتی ہے۔ نر مور، مادہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ مورنی کی بدصورتی کا سبب یہ ہے کہ اسی کو انڈے سینے پڑتے ہیں۔

بدصورت ہونے کی وجہ سے مورنی کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ مور کا ناچ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ اس کی پونچھ پر نیلے رنگ کے چاند کی شکل کے نشان ہوتے ہیں۔ جب مور ناچتا ہے تو یہ نشان اچھے لگتے ہیں۔ برسات میں یہ عام طور پر ناچتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بے حد خوش ہے۔ ناچنے کا دوسرا سبب مورنی کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی مور ناچتا ہے تو بہت سی مورنیاں اسی کے پاس جمع ہوجاتی ہیں۔ ان میں سے ایک آکر اپنے پیار محبت کا اقرار کرلیتی ہے۔ قدرت نے مور کے پَر جتنے خوبصورت بنائے ہیں، اتنے ہی اس

کے پیر بدصورت رکھے ہیں۔ یا یوں سمجھیں کہ وہ ہمیں بدصورت لگتے ہیں۔ کہتے ہیں ناچتے ناچتے اچانک مور کی نظر اپنے پیروں پر پڑتی ہے تو وہ ناچنا بند کر دیتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ مورنی جنوری سے اکتوبر کے درمیان سال میں ایک بار انڈے دیتی ہے۔ انڈوں کی تعداد چار سے آٹھ تک ہوتی ہے اور انڈے دینے کے لیے وہ درخت کے اوپر کسی کھلی جگہ پر جا بیٹھتی ہے۔ بچپن میں نر اور مادہ کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک سال کے بچے کے سر پر کلغی آتی ہے۔ کچھ بچے کلغی نکلنے کی تکلیف برداشت نہیں کر پاتے اور دم توڑ دیتے ہیں۔

بہر حال چاہے کچھ بھی ہو مور واقعی ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ 1963 میں بھارت سرکار نے اسے قومی پرندے کا درجہ دے دیا تھا جس کے بعد اس کے شکار پر زبردست پابندی عائد کر دی گئی۔ مور کے علاوہ بھی کئی جانور ناچتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ سرکس کے انسٹرکٹر اور مداری بہت سے جانوروں کو سدھا کر ناچنا سکھا دیتے ہیں۔ لیکن ہاتھیوں کو فطری طور پر کمر لچکاتے، ڈولفن کو پانی سے اوپر آ کر قلابازیاں کھاتے اور چمپانزی و بھالو کو قدرتی طور پر سر ہلا ہلا کر جھومتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہے جو ایک طرح سے ان کے رقص ہی ہوتے ہیں۔

رقص سے اب آیئے موسیقی، یعنی گانے بجانے کی طرف!

کہتے ہیں اٹلی کے ایک گاؤں میں ایسے نئے قسم کے بھوت کا پتہ چلا جو ہر رات لوگوں کے

سوجانے پر پیانو بجایا کرتا تھا۔ جیسے ہی روشنی کی جاتی، پیانو کی آواز بند ہوجاتی تھی۔ دو تین راتوں تک یہ سلسہ جاری رہا تو مالک مکان کو جس کا یہ پیانو تھا ذرا تشویش ہوئی۔اس نے پیانوگھر سے باہر لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔مگر جب وہ پیانو باہر رکھنے جارہا تھا تو اسے پیانو سے ایک چوہیا نکلتی نظر آئی جس نے پیانوکواپنا گھر بنارکھا تھا۔

جانے کیسے چوہیا کو یہ پتہ چل گیا کہ اسٹرنگ (تار) پر اس کے ادھر ادھر دوڑنے سے ایک میٹھی آواز نکلتی ہے۔ وہ انجانے میں اس آواز کی عاشق ہوگئی تھی۔لیکن جب اسے پیانو سے نکال دیا گیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ کافی غمگین رہنے لگی ہے۔ جانوروں کی نفسیات کے مشہور ماہر، ڈاکٹر ونسِ نے چوہوں کی موسیقی سے دلچسپی کے بارے میں ریسرچ کی تو پتہ چلا کہ کمرے میں پیانو کی آواز گونجتے ہی گھر کے سبھی چوہے اپنی فطری گھبراہٹ اور خوف کو بلائے طاق رکھ کر پیانو کے قریب آجاتے ہیں،اور شوق سے موسیقی کا مزہ لیتے ہیں۔ اور وہاں سے اس وقت تک نہیں بھاگتے جب تک پیانو کو جنبش نہ دے دی جائے۔لیکن دوستو صرف چوہے نہیں اور بھی بہت سے جانور ہیں جو موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں،اور اس کا مزہ لیتے ہیں۔

گائے موسیقی کے سروں کو بخوبی پہچانتی ہے اور گھنٹی کی آواز کو پہنچاننے میں تو ذرا بھی غلطی نہیں کرتی۔ پہاڑیوں اور چراگاہوں میں جانوروں کے غول کے غول گھنٹیوں کے سہارے ہی اپنے ٹھکانوں کا پتہ لگاتے ہیں۔مختلف آوازوں کی گھنٹیاں مختلف جانوروں کے گلے میں باندھ دی جاتی ہیں، اور سارے جانوران کی آواز کو پہنچاننے لگتے ہیں۔بھٹکے ہوئے جانور گھنٹیوں کی آوازوں کے سہارے دوبارہ اپنے اپنے غول میں واپس آجاتے ہیں۔ اگر کوئی اکیلا جانور اپنے گلّے سے الگ ہوجاتا ہے۔تو اسی گلّے کی مخصوص گھنٹی چرواہا ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بجاتا ہے اور وہ جانور آواز کو پہچان کر اپنے گلّے میں دوبارہ آملتا ہے۔

سرکس کے گھوڑے آواز کو بخوبی پہچاننے اور یاد رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔آواز کے بل پر ہی وہ اپنے سارے سکھائے ہوئے کرتب دکھاتے ہیں۔جبکہ کچھ کتے بھی موسیقی سے لگاؤ رکھتے ہیں،اور کچھ کتے تو کمرے سے ٹلنے کو اس وقت تک تیار نہیں ہوتے جب تک کہ پیانو نہیں بجایا جاتا۔ اگر کوئی انھیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو بے سبب

نکالنے پر ان پر بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔

کتوں کو اگر ایک خاص موسیقی اچھی لگتی ہے تو دوسری طرف بری بھی لگتی ہے۔ ایک بار گریٹ ڈین کتے نے تُرہی بجانے والوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن جیسے ہی موسیقار نے اپنی موسیقی بند کی، کتا دم ہلانے لگا۔ جبکہ وہ کتا وائلن کی آواز کو شوق سے سنتا تھا۔ ایک کتے نے اپنی مالکن کو ستار بجاتے دیکھ کر اس پر حملہ کر دیا اور اس کے جسم سے کپڑے نوچ ڈالے۔ مالکن اس کی پسند اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے جھٹ وائلن بجانا شروع کر دیا، اور کتا حیرت انگیز طور پر خاموش ہو گیا۔ بہت سے کتے موسیقی کے ساتھ اپنا سر ہلاتے ہیں۔

وہیل مچھلی کا موسیقی سے عشق اور لگاؤ مشہور ہے۔ شکاری اپنی ناؤ پر وائلن بجانا شروع کرتے ہیں، وائلن کی آواز سن کر وہ اس کی دھُن میں ایسی کھو جاتی ہے کہ شکاری اسے بآسانی اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔

مچھلیاں گھنٹیوں کی آواز بھی بخوبی پہچانتی ہیں۔ سمندر کے کنارے گرجا گھروں میں گھنٹیوں کی آواز جیسے ہی شروع ہوتی ہے غول در غول مچھلیاں کنارے پر آ کر بڑے غور سے گھنٹیوں کی آواز سنتی ہیں۔

ایسا لگتا ہے جانوروں کو وائلن کی آواز سب سے زیادہ پسند ہے۔ چمپانزی وائلن کی آواز کے ساتھ ٹیبل بجانے کی کوشش کرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ جیسے ہی وائلن بجانا بند کیا گیا وہ اس طرح چیخ اٹھا جیسے کوئی بچہ اپنا مرغوب کھلونا چھن جانے پر چیختا اور چلّاتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ جانور اس آواز کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو ان کی آواز سے ملتی جلتی ہو۔ سیٹی بجانے والے جانور بانسری کی آواز کو کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔

ایک ہاتھی شنکھ کی آواز سن کر جھومنے لگا۔ لیکن شنکھ کی آواز ختم ہوتے ہی وہ ایک دم خاموش اور غمگین ہو گیا۔ امتحان کے طور پر دوبارہ شنکھ بجایا گیا تو وہ دوبارہ خوش نظر آنے لگا۔

▲ فرانسس براڈ کی مشہور پینٹنگ: ہز ماسٹرس وائس

چڑیوں کو بھی موسیقی بے حد پسند ہے۔ خاص کر الّو اور گدھ کو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چڑیا جانوروں کی موسیقی کی استاد ہے۔

مینا اپنی آواز کو اتنی خوبصورت ڈھنگ سے نکالتی ہے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ کوئل میں بھی یہ خاصیت ہوتی ہے۔ کئی بار اس کی آواز اور سروں کے اتار چڑھاؤ میں بعض راگوں سے ملتا جلتا قرینہ بھی ہلکا سا جھلکنے لگتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کیڑے بھی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں موسیقی سے بے حد لگاؤ رکھتی ہیں۔ آپ نے پرانی ریکارڈ کمپنی ہز ماسٹرز وائس کے ریکارڈ پر گراموفون سنتے ہوئے کتّے کی تصویر دیکھی ہوگی۔ یہ دراصل ایک ٹیریئر Terrier کتّے کی تصویر ہے جو انگریز مصور فرانسس براڈ Francis Barraud نے اپنے مرحوم بھائی کے کتّے کو دیکھ کر بنائی تھی۔ گھر میں مرحوم بھائی کی آواز کے کئی سلنڈر فونوگراف Cylinder Phonograph تھے جن کے بجتے ہی کتّا گراموفون کے آگے آ کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے مالک کی آواز سنتا رہتا تھا۔ گراموفون کمپنی نے اس پینٹنگ کو خرید کر 1899 میں اپنا ٹریڈ مارک بنا لیا! □

Mohd Qayyum Meo
A/4, Ayub Manzil Karim Nagar,
PO Taj Ganj Dist Agra - 282001(UP)

مضمون

□ عظیم اقبال

جگنو کی روشنی

جگنو ایک اڑنے والا کیڑا یعنی پتنگا ہے اور اپنی ٹمٹماتی روشنی کی وجہ سے صرف اندھیرے میں دکھائی دیتا ہے۔ جگنو اپنی روشنی کے لیے مشہور ہے۔ موسم برسات کا ہو اور آپ سنسان مگر ہرے بھرے علاقے سے گزریں تو کسی پیڑ یا جھاڑی کے ارد گرد بے شمار جگنوؤں کو دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ اس حیرت کو شاعروں نے خوب بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
پروانہ بھی پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

کسی اور نے کہا:

یہ رات یہ خموشی یہ خواب کے نظارے
جگنو ہیں یا زمیں پر اترے ہوئے ہیں تارے

بھنوروں کی ایک نسل سے تعلق رکھنے والے جگنو کی جلتی بجھتی روشنی مادہ جگنو کو لبھانے اور بہت چھوٹے کیڑوں پتنگوں کے شکار میں مددگار ہوتی ہے یا پھر یہ حفاظت کے لیے چوکنا رہنے کا اشارہ ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق ماہرین ابھی تک کسی آخری نتیجے تک نہیں پہنچے ہیں۔ انگریزی میں اسے فائر فلائی Fire Fly یا سیدھا ترجمہ کریں تو آگ کی مکھی کہتے ہیں۔ اگرچہ سائنسداں جگنو کی روشنی کے مقصد کے

اوپر اور نیچے، خاص کیمرہ تکنیک سے لی گئی جگنوؤں کی تصویریں

بارے میں کوئی پکّی رائے نہیں رکھتے، پھر بھی روشنی کا یہ راز وہ جان چکے ہیں کہ وہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ جگنو کے چمکنے کے عمل کو بایولوجی میں بایولومی نیسنس Bioluminescence کہتے ہیں۔

جگنو کی جلتی بجھتی روشنی یا سبزی مائل سفید رنگ کی 'سرد آگ' اس کے معدے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک کیمیائی عمل ذمہ دار ہے جو ایک اینزائم Enzyme کے معدے میں آنے سے ہوتا ہے۔ اس اینزائم کو لوسی فیریز Luciferase کہتے ہیں جس کے کیمیائی ردعمل سے وہ خلیے Cells روشن ہو جاتے ہیں ہے جنھیں Photocytes کہا جاتا ہے۔

ہم سب نے جو جگنو دیکھے ہیں، وہ عام جگنو ہیں اور عام جگنو سبز یا تیز زرد روشنی خارج کرتے ہیں۔ لیکن جگنوؤں کی دو ہزار قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر چمکتے ہیں۔

قدرت کے کارخانے میں بے شمار عجیب چیزیں ہیں۔ تین انچ کا ایک ایسا بھنورا بھی پایا جاتا ہے جسے ریلوے بیٹل کہتے ہیں۔ یہ

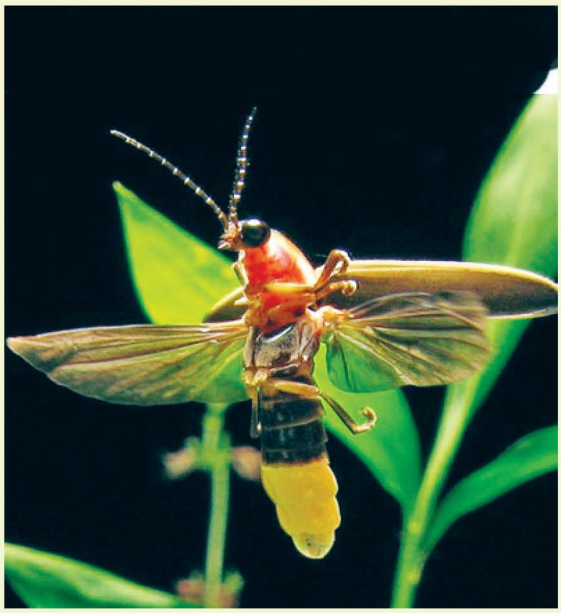

▲ امریکہ کے مشرقی علاقوں میں پایا گیا عجیب وغریب جگنو جسے 'ریلوے فائر فلائی بیٹل' یا مختصر طور پر 'ریل جگنو' کہتے ہیں کیونکہ یہ ریلوے سگنل کی تین رنگوں والی روشنی کے ساتھ چمکتا دمکتا ہے

▲ جگنو کی روشنی اس کے معدے میں پیدا ہوتی ہے

جگنو عجیب وغریب خوبیوں کا مالک ہے۔ یہ اپنے جسم کے دونوں طرف سرخ روشنی چھوڑتا ہے، اور درمیانی حصے میں کئی جگہوں پر سبز روشنی دیتا ہے۔ ریلوے کراسنگ پر اس طرح کی سرخ وسبز روشنی کا سنگم آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ کچھ پرندے اپنے آشیانوں میں جگنو کو قید کر کے اپنا مسکن روشن کر لیتے ہیں۔ اپنے نفیس گھونسلوں کے لیے مشہور بیا کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے لیکن یہ محض ایک دل چسپ خیال آرائی ہے۔ جانور عام طور سے ایسا نہیں کرتے۔ وہ کسی جانور کو قید کرنے کی بجائے یا تو اسے کھا جاتے ہیں یا کسی جانور کے ذریعے کھا لیے جاتے ہیں۔ یعنی جانور یا تو جانوروں کا شکار کرتے ہیں یا خود شکار ہو جاتے ہیں۔ انسان کی طرح نہیں کہ جانوروں کو قید بھی کرتا ہے، شکار بھی کرتا ہے اور انھیں کھا بھی جاتا ہے۔

ویسے کبھی نہ کبھی آپ نے بھی رومال میں، دوپٹے میں، مچھر دانی میں جگنو کو قید کیا ہوگا اور بڑوں کی ڈانٹ سننے پر اسے رہائی دی ہوگی۔ ظاہر ہے جگنو کی روشنی آپ کو چونکا دیتی ہے اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ اس کو پکڑ کر اس کا راز معلوم کریں اور روشنی کو قریب سے دیکھیں۔ اس لیے عزیز دوستو! آپ جگنو کو ضرور پکڑیں اسے ہتھیلی پر رکھیں لیکن ذرا احتیاط سے۔ مگر ہاں مٹھی بالکل بند نہ کریں، ورنہ بے چارے کی جان پر بن آئے گی۔ ہے نا! □

Azim Iqbal
Adabistan Ganj No. I Bettiah - 845438 Bihar

□اسماعیل میرٹھی

بچّہ اور جگنو

سناؤں تمھیں بات اک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی

چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں
ہوا میں اڑیں جیسے چنگاریاں

پڑی ایک بچّے کی ان پر نظر
پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر

چمک دار کیڑا جو بھایا اسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے

وہ چم چم چمکتا اِدھر سے اُدھر
پھرا کوئی رستہ نہ پایا مگر

تو غم گین قیدی نے کی التجا
کہ چھوٹے شکاری مجھے کر رِہا

خدا کے لیے چھوڑ دے چھوڑ دے
مری قید کے جال کو توڑ دے

کروں گا نہ آزاد اس وقت تک
کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

چمک میری دن میں نہ پاؤ گے تم
اجالے میں ہو جائے گی یہ تو گم

ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے
کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے

اجالے میں دن کے کھلے گا یہ حال
کہ اتنے سے کیڑے میں کیا ہے کمال

دھواں ہے نہ شعلہ نہ گرمی نہ آنچ
چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب
کہ ذرّے کو چمکائے جیوں آفتاب

مجھے دی ہے اس واسطے یہ چمک
کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹھک

نہ الہڑ پنے سے کرو پائمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال

پیارے دوستو جناب اسماعیل میرٹھی (پیدائش 1844 وفات 1917) انیسویں صدی کے عظیم اردو استاد تھے۔ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اردو سکھانے کے لیے پرائمری اور مڈل اسکولوں اور مدرسوں کا پہلا اردو کورس انھوں نے ہی تیار کیا تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ ہمارے والدین اور ان کے والدین میں بھی اکثر نے اسی کو پڑھ کر اردو سیکھی ۔اس کورس کی کتابوں میں مضمونوں کے ساتھ نظمیں بھی انھوں نے خود ہی لکھی تھیں۔ یہ نظم بھی اسی کورس کی کتاب سے لی گئی۔ ذرا دیکھو کتنے سیدھے سچّے اور عام لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے انھوں نے یہ نظم لکھی ہے! ن ظ

کامکس کہانی

الف لیلہ سے

علی بابا
اور چالیس چور

الف لیلہ
کی مشہور کہانی
علی بابا اور چالیس چور
خدا حافظ علی! مگر میرے سرتاج راستے میں چالیس چوروں سے بچنا، ان کے ملنے کا مطلب ہے موت!
یہ بے وقوف عورتیں کتنی ڈرپوک ہوتی ہیں! چالیس چوروں کی ایسی تیسی! مجھے مل گئے تو وہ سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے
چالیس چور آ گئے!
یا خدا رحم! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ فوراً کہیں چھپ جانا چاہیے!

میرا خیال ہے انھیں کسی اور وقت
سبق دینا مناسب رہے گا!

لو ہم آ گئے اے گدھ کے بیٹو!
جیسے ہی جادوئی لفظ دوہراؤں
گھوڑوں سے اتر پڑنا

کھل جا
سم سم!!

جادوئی لفظ بولتے ہی زبردست چٹان ایک طرف کھسک گئی۔ اندر غار
میں چوروں نے چوری کی ہوئی چیزوں کا بیش قیمت خزانہ جمع کر دیا

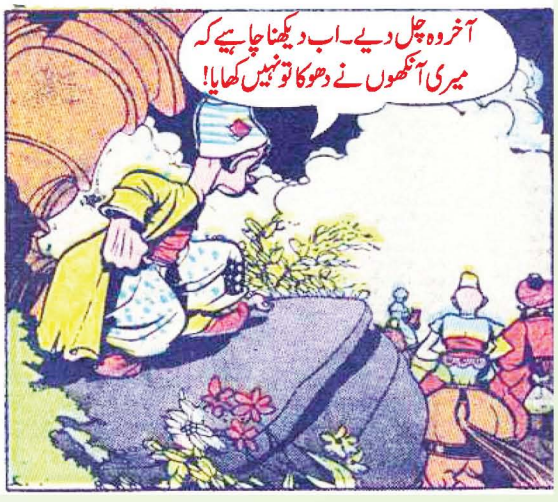
آخر وہ چل دیے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ
میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا!

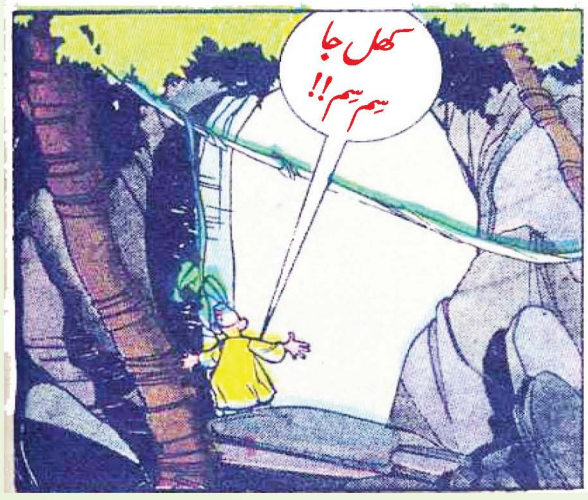
کھل جا
سم سم!!

کھل گیا! چلو اندر چل کر دیکھتے ہیں!
یا علی! کیا ہیرے ہیں! کیا دولت ہے! اس خزانے کا تھوڑا سا حصہ بھی لے چلوں تو بادشاہ جتنا امیر بن جاؤں!
اور پھر مجھے اس سے روکنے والا یہاں ہے بھی کون!
واہ! علی بابا کی پھٹی پرانی جیبوں کے تو نصیب ہی جاگ اٹھے!
اس سے پہلے کہ چور واپس آئیں یہاں سے بھاگ لینا چاہیے
بند ہو جا سِم سِم!

چالیس چور جلدی ہی واپس آ گئے
پیاری بیگم! میں امیر ہو گیا۔ مجھے چالیس چوروں کا خزانہ مل گیا!
ہش! چپ رہو بے وقوف! اندر آؤ
علی بابا نے پورا واقعہ سنا دیا
خزانے کی قیمت جاننے کے لیے میں قاسم کے گھر سے زیور تولنے کی ترازو مانگ لاتی ہوں!
کیا مجھے زیور تولنے کی ترازو ادھار دو گے قاسم بھائی؟
کیوں نہیں بھابھی! میری بیوی تمھیں ترازو لا دے گی!
وہ ترازو کیوں مانگ رہی ہے؟ میرا بھائی تو قبرستان کے چوہے سے بھی زیادہ غریب ہے
اپنے بھائی قاسم کی ترازو میں تول کر علی بابا نے چالیس چوروں کے خزانے سے لی ہوئی دولت کا حساب لگا لیا!
دیکھو، تمھارا بھائی ہماری ترازو واپس لا رہا ہے۔ اب ہمیں ترازو لے جانے کی وجہ معلوم ہو جائے گی
ترازو کے لیے بے حد شکریہ بھائی صاحب!
مجھے خوشی ہے کہ تمھیں ترازو کی ضرورت پڑنے لگی! خدا کرے تم ہمیشہ خوش حال رہو!

Ali Baba And The Forty Thieves سے ماخوذ/ انگریزی سے ترجمہ: شبنم پروین

جاری...

ادارہ

◆ سنتا: یار یہ آکس فورڈ کیا چیز ہے؟

بنتا: آکسفورڈ کا مطلب ہے بیل گاڑی

سنتا: اچھا؟ وہ کیسے؟

بنتا: سیدھی سی بات ہے۔ آکس Ox کہتے ہیں بیل کو اور فورڈ Ford ہوتی ہے ایک گاڑی

شیخ کیف، بھیونڈی، مہاراشٹر

◆ ببلو: میک ڈونلڈ چلیں؟

ڈبلو: اسپیلنگ Spelling بتاؤ تو چلیں گے

ببلو: ایک کام کرو۔ کے ایف سی چلتے ہیں!

ڈبلو: تو پھر کے ایف سی کا فل فارم بتاؤ

ببلو: رہنے دو یار۔ سموسہ ہی کھلا دو!

صدف، بھیونڈی

◆ غلطی ماننے اور بری عادت چھوڑنے میں دیر مت کرو، کیونکہ سفر جتنا طویل ہوتا جائے گا واپسی اتنی ہی دشوار ہوگی

زیاد اسلم۔ رانی گنج

◆ ممّی اردو ٹھیک سے نہیں بول پاتی تھیں۔ ایک دن منّے نے پوچھا، پاپا روز کہاں جاتے ہیں؟ ممّی نے کہا۔ ''کارکھانے۔'' (کارخانے)

منّا بولا: ''اچھا!؟ مگر اتنی بڑی کار پاپا کیسے کھاتے ہوں گے ممّی؟''

◆ سنتا: یار سورج رات کو کیوں نہیں دکھائی دیتا!

بنتا: رات کو اندھیرا ہوتا ہے نا، اس لیے!

◆ والد ٹیچر سے: جناب میرا بیٹا تاریخ میں کیسا ہے؟

ٹیچر: یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

والد: اس لیے کہ جب میں پڑھتا تھا تو مجھے تاریخ سے سخت نفرت تھی!

ٹیچر: بس تو سمجھ لیجیے تاریخ خود کو دوہرا رہی ہے!

ان سب نے نام پتہ نہیں لکھا

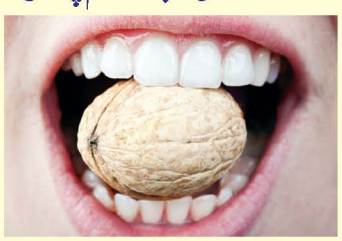

◆ پوتے نے دادا سے پوچھا: آپ کے منھ میں کتنے دانت ہیں دادا جی؟

دادا بولے: بیٹا میرے دانت نہیں ہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا کوئی خاص کام ہے؟

پوتا: ذرا میرے اخروٹ اپنے پاس رکھ لیجیے۔

سلمان انصاری، کھتولی مظفرنگر، یوپی

◆ ایک لیڈر نے تقریر کرنے کے بعد کہا، ''اگر آپ کوئی سوال کرنا چاہیں تو کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں۔ میں اس کا ابھی جواب دوں گا۔''

ایک شخص نے کاغذ پر 'گدھا' لکھ کر بھیج دیا۔

لیڈر نے پرچہ پڑھا اور پڑھ کر کہا، ''ایک صاحب نے پرچے پر صرف اپنا نام لکھا ہے، سوال لکھنا بھول گئے۔''

محمد توحید، مالیگاؤں مہاراشٹر

◆ تم ایک پنسل بن کر کسی کو خوشیاں نہیں لکھ سکتے تو ربر بن جاؤ تاکہ اس کے غم ہی مٹا سکو!

◆ زندگی ایسے جیو کہ کوئی ہنسے تو تمھاری وجہ سے ہنسے، تم پر نہیں۔ اور کوئی روئے تو تمھارے لیے روئے تمھاری وجہ سے نہیں!

ٹی ابراہیم

◆ مالک نے کسی کو نوکر رکھنے سے پہلے پوچھا: کتنا پڑھے ہو؟
نوکر: پی پی ایم ایف
مالک: ایں! یہ کون سی ڈگری ہے؟
نوکر: پرائمری پاس، مڈل فیل

◆ استاد: پانچ اور پانچ کتنے ہوتے ہیں؟
طالب علم: دس
استاد: شاباش یہ لو دس روپے انعام کے!
طالب علم: کاش پانچ جمع پانچ 500 سو ہوا کرتے!

!!! ???
5+5= 500
??? !!!

◆ استاد: بتاؤ چیونٹیوں سے ہمیں کیا فائدہ ہوتا ہے؟
شاگرد: چیونٹیوں کی قطار دیکھ کر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امّی نے مٹھائی کہاں چھپا کر رکھی ہے؟

سعد عامر، مالیگاؤں

◆ چوزہ مرغی امّاں سے: ماں جس طرح انسان اپنے نام رکھتے ہیں اسی طرح ہمارے نام کیوں نہیں ہوتے؟

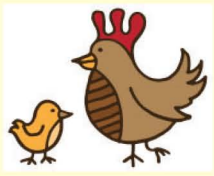

مرغی امّاں: بیٹا ہماری برادری میں نام ہمارے مرنے کے بعد رکھے جاتے ہیں۔ جیسے، چکن ٹکّا، چکن فرائی، چکن تندوری، چکن لالی پاپ، چکن بریانی وغیرہ۔

محمد تفضّل انصاری

◆ ایک بچّہ روتا ہوا اسکول سے گھر آیا۔
ماں نے پوچھا: کیوں رو رہا ہے؟
بچّہ: مجھے ٹیچر نے مارا
ماں: ٹیچر نے کیوں مارا؟
بچّہ: میں نے اسے مرغی کہہ دیا تھا!
ماں: بدتمیز نالائق، تو نے ٹیچر کو مرغی کیوں کہا؟
بچّہ: اس نے مجھے ہر پیپر میں انڈا دیا تھا!

شاداب عالم، شاہین باغ، نئی دہلی

◆ دہلی کے ایک بک اسٹال پر ایک کتاب کا صرف نام پڑھ کر ہی ایک امریکی ڈاکٹر کو دل کا دورہ پڑ گیا۔
کتاب کا نام تھا: 30 دن میں ڈاکٹر بنیں!

افتخار احمد کامپٹی، مہاراشٹر

◆ استاد: جانوروں کے بال لمبے کیوں ہوتے ہیں؟
شاگرد: اس لیے کہ جنگل میں حجام نہیں ہوتے

مصعب انصاری، دیوپور دھولیا

◆ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرنے والا ایک پانچ سالہ بچّہ میڈیکل اسٹور پہنچا اور اسٹور والے کو دس روپے دے کر بولا: انکل میرے پاس اتنے ہی پیسے ہیں۔ مجھے دس روپے کا ایک معجزہ دے دیجیے۔
اسٹور والے نے پوچھا: تمھیں معجزے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟
بچّہ معصومیت سے بولا: میری ماں بیمار ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اب معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے!

مومن وجاہت علی سوداگر محلّہ بھیونڈی

◆ ایک بچّے کا خط، میتھ میٹکس کے نام:

جناب میتھ میٹکس صاحب
پلیز جلدی سے بڑے ہو جائیں! آئندہ آپ اپنے سوال خود حل کیا کریں۔ آخر کب تک دوسروں کا سہارا لیتے رہیں گے؟

◆ زندگی میں اِن تینوں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا:
والدین
سچّا دوست
سچّائی

◆ ایک بھکاری کی 80 لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا، ''اتنے روپیوں کا کیا کرو گے۔''

بھکاری نے خوشی خوشی کہا،''اس رقم سے میں ایک مسجد بنواؤں گا، ایک مندر بنواؤں گا اور ایک گوردوارہ بنواؤں گا...اور تینوں میں اکیلے بھیک مانگوں گا۔''

مرزا عامر بیگ، حبیب نگر، اکولا

• سر میں نے اے ایم یوسٹی گرلز ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں 97% فی صد سے ٹاپ کیا ہے!

ایم منیب اختر

مبارک ہو منیب۔ ہماری مٹھائی پکّی ہے نا؟ ن ظ

• ٹریفک کانسٹبل: 240 کی اسپیڈ سے بائیک کیوں چلا رہے ہو؟

بائیک سوار: آپ ہی نے تو بورڈ پر لکھوا رکھا ہے، 'یاد رکھیے گھر پر کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے'

عبداللہ راشد اقبال، دھولیا

• فون پر گفتگو:

''ہیلو، آپ کے گھر میں فرِج ہے؟''

''ہاں ہے۔ آپ کون؟''

''چل رہا ہے؟''

''ہاں چل رہا ہے۔''

''تو پھر پکڑ لو! ورنہ بھاگ جائے گا''

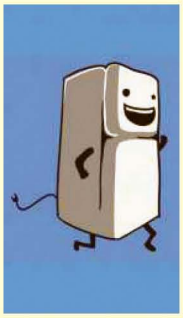

''ارے مگر تم ہو کون؟...لعنت ہے! کاٹ دیا''

کچھ دیر بعد دوبارہ فون آیا۔

''کیا آپ کے گھر میں فرِج ہے؟''

''نہیں ہے...اب کہو کیا کہنا ہے؟''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا پکڑ لو۔ چلا گیا نا!...''

عنبرین راشد اقبال دھولیا

• جب کوئی ایس ایم ایس نہیں کرتا تو اتنا غصہ آتا ہے کہ دل یہی چاہتا ہے چپل اتار کر.....

...آرام سے بیٹھ جاؤں اور سوچوں، شاید ایس ایم ایس بھیجنا نہیں آتا ہوگا۔

آفرین شیخ، دھولے، مہاراشٹر

• آج کی مشکل یہ ہے کہ موبائل بگڑ جائے تو بچّہ ذمّہ دار اور بچّہ بگڑ جائے تو موبائل ذمّہ دار!

خِلقت، اے جے سی بوس کالج کولکاتا

• گاؤں کی ایک بزرگ خاتون بینک میں گئی تو کلرک نے ایک فارم پر دستخط کرنے کو کہا۔ عورت نے پوچھا وہ کیا ہوتا ہے۔ کلرک نے کہا، وہی جو تم اپنے خط کے آخر میں لکھتی ہو۔

عورت نے دستخط والی جگہ پر لکھا: تمھاری ماں مینا کشی!

• ایک مرتبہ ملّا نصر الدین کے سر پر کوّے نے بیٹ کر دی۔

اس پر ملّا نے بے اختیار کہا،''اللہ تیرا شکر ہے کہ گائے بھینس، اونٹ اور ہاتھی، اڑ نہیں سکتے ورنہ اوپر سے کچھ اور ہی آیا کرتا!''

نعمان انصاری، مالیگاؤں

• ڈی ایڈ D Ed کرنے والے نوجوان کی لو اسٹوری

میں 3 سال کا تھا جب وہ پیدا ہوئی

میں اسکول جانے لگا تب وہ 2 سال کی تھی

میں 2 میں تھا اور وہ KG میں

میں 7 میں تھا وہ 4 میں

میں 12 میں وہ 9 میں

میں B Ed میں وہ 10 میں

میں CET میں وہ BA میں

میں CET میں وہ MA میں

میں CET میں وہ M Phil میں

میں CET میں وہ Ph D میں

میں CET میں اور اسے Ph D مل گئی

کل اس کی شادی ہے اور میرا CET کا پیپر ہے!

عفیفہ ظفر قدوسی، کامپٹی

• ان پرندوں کو قید کرنا میری فطرت میں نہیں جو میرے دل کے پنجرے میں رہ کر بھی دوسروں کے ساتھ اڑنے کا شوق رکھتے ہیں۔

◆انکل، شاعری نے اردو کو وہ مقام بخشا ہے کہ آج اردو زبان پوری دنیا میں جانی جاتی ہے۔ اس لیے آج کے بچّوں کو اردو شاعروں کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شمارے میں کسی ایک شاعر کا تعارف اس کی غزل یا شعروں کے ساتھ شائع کریں اور ہمیں شکریہ کا موقع دیں!

عمران احمد، مالیگاؤں

شکریہ تو عمران میاں آپ کا کہ ایک اچھا مشورہ دیا۔ ہم اس پر عمل کی پوری کوشش کریں گے۔ ن ظ

◆ایک مریض لمبی اور گہری بے ہوشی Coma کی حالت سے باہر آیا تو اس کے رشتے دار جھک جھک کر ہسپتال کے پرانے ائر کولر کا شکریہ ادا نے کرنے لگے! یہ دیکھ کر وہاں موجود نرس نے حیرت سے پوچھا، ''ارے آپ بار بار اس شور کرنے والے کولر کے آگے کیوں جھک رہے ہیں؟''

ایک رشتے دار نے کہا، ''سسٹر، سارے ڈاکٹر ہمارے مریض کو کوما سے نکالنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ مگر آج جیسے ہی اس زوردار مشین کو چلایا گیا مریض نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں!''

محمد مصطفیٰ، اے ٹی ٹی ہائی اسکول، مالیگاؤں

◆زندگی کا سب سے بڑا سسپنس یہ ہے کہ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ہم کس کے لیے جی رہے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں جان پاتے کہ کون ہمارے لیے جی رہا ہے!

مصباح پٹھان، شولا پور، مہاراشٹر

◆میں مدھوبنی بہار کے گاؤں باجھن گاواں کا رہنے والا ہوں اور کولکاتا میں زیرِ تعلیم ہوں۔ رسالہ 'بچّوں کی دنیا' مجھے بہت اچھا لگتا ہے، اس سے ہم لوگوں کو اچھی اچھی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ آپ کو اسے اور بھی اچھا بنانے کی توفیق دے۔ آمین!

محمد رحمت اللہ، کولکاتا

شکریہ رحمت اللہ صاحب!

◆ڈرائنگ کے ٹیچر نے ایک بچّے کی خراب ڈرائنگ دیکھ کر غصّے میں کہا، ''جانتے ہو جارج واشنگٹن تمھاری عمر میں بڑے اچھے مصوّر تھے۔'' بچّے نے برجستہ کہا، ''کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی عمر میں امریکہ کے صدر بن چکے تھے!''

انجان مسافر، اورنگ آباد

◆ایک شخص رات میں سگریٹ جلانے کے لیے بستر سے اٹھا اور ماچس ڈھونڈنے لگا۔ مگر بہت تلاش کرنے پر بھی ماچس نہیں ملی۔ آخر بے چارے نے تھک ہار کر موم بتّی بجھائی اور سو گیا!

انجم افشاں کلٹی

◆دل چاہتا ہے کہ تم کو وہ چیز کھلا دوں جو تم نے کبھی نہ کھائی ہو۔ جیسے:

ککڑی کا کیک

مرچ کا جوس پیاز کی چائے

کریلے کا حلوہ

کیلے کے چھلکے

بینگن کا شربت

تب تمھیں پتہ چلے گا کہ دوستوں کو بھول جانے کی سزا کیا ہوتی ہے!

◆آج کے زمانے میں بیٹی کا مطلب ٹین شن Tension نہیں ہے

آج ایک بیٹی کا مطلب ہے ٹین سن Ten- son!

◆ایک بات ہمیشہ یاد رکھو

بدلتی ہوئی چیزیں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں لیکن بدلتے ہوئے اپنے کبھی اچھے نہیں لگتے!

◆اگر دو لوگوں کے بیچ کبھی جھگڑا نہ ہو تو سمجھ لو رشتہ دل سے نہیں دماغ سے نبھایا جا رہا ہے۔

◆ٹیچر: گنگا، جمنا، کرشنا، پدما، شاردا ہماری ندیوں کے نام ہیں۔ کیا کوئی پاکستان کی ندیوں کے نام بتا سکتا ہے

ایک اسٹوڈنٹ: سر، اگر وہاں بھی ندیوں کے نام اسی طرح رکھے گئے ہیں تو اُن کی مشہور ندیاں ہونی چاہئیں، رخسانہ، رضوانہ، خالدہ، سلطانہ...

صحیہ شیخ، مہاراشٹر

ننھے فنکار

ادارہ

ہاتھی سے انٹرویو

شاہونگر جلگاؤں مہاراشٹر کے عاطف عدنان نے انگریزی کے ایک دل چسپ مضمون Meet An Elephant کا اردو ترجمہ کرکے ہمیں بھیج دیا ہے۔ اس مضمون میں ایک رپورٹر ہاتھی صاحب کا انٹرویو لیتا ہے جو بڑا دل چسپ اور معلوماتی ہے۔ پڑھ کر دیکھیے:

رپورٹر: صبح بخیر، جناب دانت والا، آج آپ تنہا کیوں ہیں؟ کیا آپ کی بیگم آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟

ہاتھی: وہ ایسا ہے کہ ہم خاندان بنا کر نہیں رہتے۔ تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ البتہ ہتھنیاں غول میں رہتی ہیں اور کبھی غول سے جدا نہیں ہوتیں۔

رپورٹر: یعنی آپ ہمیشہ بانکے چھیلا رہتے ہیں، بھلا ایسا کیوں؟

ہاتھی: ہمارے بچھڑے کو بڑھنے میں بہت وقت لگتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ماداؤں کو غول میں رہنا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ آسانی سے اپنی حفاظت کرسکتی ہیں۔ ماں اور بچھڑے میں ماں کے پیٹ سے شروع ہونے والا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ ہم دودھ والے جانوروں میں ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کا عرصہ سب سے لمبا ہوتا ہے۔ تقریباً دو برس کا۔ بالغ ہوجانے پر نر ہاتھی اپنا غول چھوڑ کر چلا جاتا ہے لیکن مادہ ہاتھی غول ہی میں رہ جاتی ہے۔

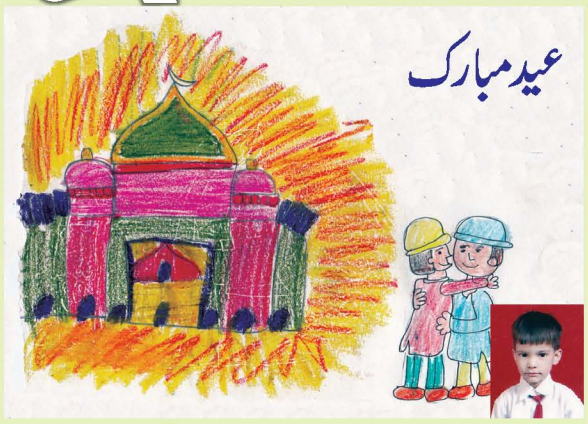

ڈرائنگ: محمد واصف انور، کریسنٹ اسکول دریا گنج نئی دہلی

ڈرائنگ: نورین، کریسنٹ اسکول دریا گنج نئی دہلی

رپورٹر: ایک غول میں اتنے بہت سے ہاتھی ہونے کی وجہ سے انھیں ڈھیروں کھانے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہاتھی: (ہنس کر) ہاں! سائز میں ہم دوسرے نمبر کے سب سے بڑے زمینی جانور ہیں۔ 3 میٹر کی اونچائی اور 1.4 میٹر لمبے ہاتھی دانتوں کے ساتھ ہمارا وزن تقریباً 6100 کلوگرام ہوتا ہے۔ سائز میں زمین پر سب سے بڑے میرے افریقی بھائی کی اونچائی 3.4 میٹر اور وزن تقریباً 7110 کلوگرام ہے۔ اس کے دانت 2.1 میٹر لمبے ہوتے ہیں۔

رپورٹر: کیا ہتھنیوں کے بھی دانت ہوتے ہیں؟

ہاتھی: نہیں۔ اس معاملے میں ہم افریقی بھائیوں سے ذرا الگ ہیں۔ ان میں نر اور مادہ دونوں کے دانت ہوتے ہیں۔ ہم میں بغیر دانت والے نر بھی ہوتے ہیں جو ہم سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

رپورٹر: یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ آپ کیا کتنا کھاتے ہیں؟

ہاتھی: ہم پوری طرح سبزی خور ہیں اور زیادہ تر جنگلی پودے، تاڑ کے درخت، بانس اور گھاس پودوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمیں ہر روز تقریباً 270 کلوگرام غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم روزانہ سونڈ سے ایک وقت میں تقریباً 9 لیٹر پانی کھینچ سکتے ہیں۔ بڑا ہاتھی روزانہ تقریباً 227 لیٹر پانی پیتا ہے۔ ہم غول میں مل کر ہی کھاتے ہیں اور زیادہ تر وقت کھانے میں ہی چلا جاتا ہے۔ ہم اگر ایک جگہ زیادہ دنوں تک رہ جائیں تو تمام جنگل تو تباہ ہوگا ہی پانی کا ذخیرہ بھی سوکھ جائے گا۔

رپورٹر: یہ سب بہت عجیب ہے۔ دشمنوں سے اتنے بڑے جسم کی حفاظت بھی مشکل ہوتی ہوگی؟

ہاتھی: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا دشمن کوئی نہیں۔ ہاں شیر ضرور ہمارے بچھڑوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ ہمارے سب سے بڑے دشمن ہمارے دانت اور معاف کیجیے، آپ حضرتِ انسان ہیں۔

رپورٹر: ٹھیک کہا! لوگ واقعی آپ کے دانتوں عاشق ہیں۔

ہاتھی: یہ دانت شکاری جانوروں سے حفاظت کے لیے ہیں جب کہ انسان ان کا استعمال اپنا ڈرائنگ روم سجانے کے لیے کرتا ہے۔ غیر قانونی طریقے سے شکار کرنے والے لوگ نر ہاتھیوں کو خوفناک حد تک تکلیف پہنچا کر مار ڈالتے ہیں۔ اس قتل عام نے ہماری آبادی گھٹا دی ہے۔ ہمارا وجود خطرے میں ہے اور یوں ہی چلتا رہا تو ایک دن ہم ختم ہو جائیں گے۔ ہمارے جنگلوں پر انسانوں کے قبضے دوسرا بڑا خطرہ ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مغرب میں عراق سے لے کر ہمالیہ کے جنوب میں پورے براعظم، ایشیا اور مشرق میں چین تک ہماری آبادی تھی۔ آج یہ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان میں یا اس کے مغرب کے ملکوں میں تو ہم نظر ہی نہیں آتے۔ بھارت، سری لنکا، برما اور جنوب مشرقی ایشیا کے کچھ ملک ہمارے آخری ٹھکانے ہیں۔

رپورٹر: لگتا ہے بس آپ کے افریقی بھائی زندہ بچیں گے۔ کیا لمبے بالوں والے ہاتھی آپ کے پُرکھے تھے، جو ہزاروں سال پہلے ختم ہو چکے ہیں۔

ہاتھی: جی ہاں! اور اب ان میں جا ملنے کی ہماری باری ہے، ہے نا؟

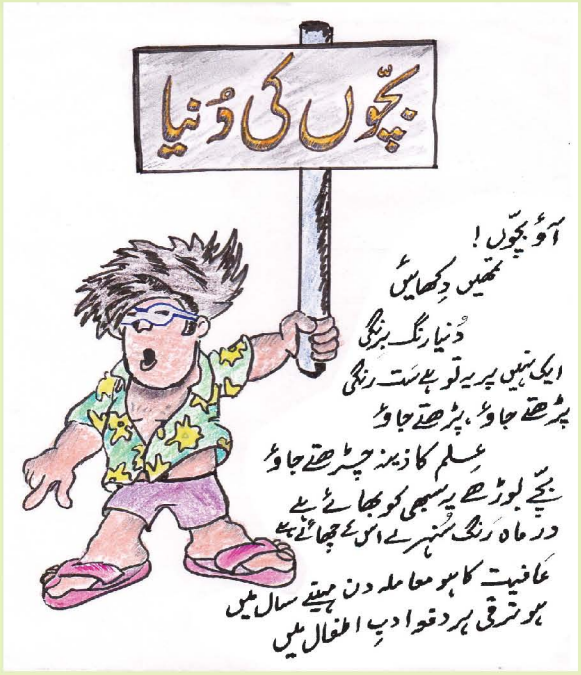

ڈرائنگ: آصف جلیل احمد، مالیگاؤں

رپورٹر: اس پر مجھے حیرانی نہیں ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ آپ ہمارے جنگلات میں آزاد گھومتے تھے۔ پھر کیا ہو گیا؟

ہاتھی: چوتھی صدی عیسوی میں ہمارے باپ دادا پنجاب اور سوراشٹر کے خشک علاقوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ اب ہماری گشت کا حلقہ جنوبی بھارت، وسطی بھارت، ہمالیہ کی ترائی اور شمال مشرقی ریاستوں کے جنگلات اور پہاڑیوں تک سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اگلے وقتوں کے بڑے جنگلات کو سڑکوں نے چھوٹے جنگلی ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جہاں ہمارا رہنا مشکل ہے۔ غیر قانونی شکار کی وجہ سے ہماری آبادی گھٹ کر پندرہ ہزار کے قریب رہ گئی ہے۔

رپورٹر: یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ جیسے شریف جانور کو بچانے کے لیے ہمیں ہاتھی دانت سے بنی چیزوں سے توبہ کر لینی چاہیے۔

ہاتھی: شکریہ، اب مجھے ذرا بھوک لگ رہی ہے۔ اس لیے اجازت دیں۔

رپورٹر: آپ کا بھی شکریہ کہ ہمیں اتنی عجیب و غریب باتیں بتائیں! □

Atif Adnan Sheikh Sadiq
Taj Pan Center, Shahu Nagar, Jalgaon-425001 Maha.

قسط وار داستان

دوسری قسط

اُلٹا دَرَخت

کرشن چندر

اب تک آپ نے پڑھا کہ ایک موچی کا تھوڑا سا بے وقوف مگر منھ پھٹ اور بے روزگار بیٹا یوسف اپنی ماں کے کہنے پر بادشاہ کے پاس کام مانگنے گیا تو ہکلے اور ظالم بادشاہ نے اس کے خوب صورت باغیچے پر ہی قبضہ کرلیا۔ وہاں ایک نک چڑھی شہزادی ملی۔ اس نے یوسف کی ماں کا کنواں چھین لیا۔ اب غریب یوسف کے پاس ماں کے علاوہ ایک جھونپڑی اور ایک گائے رہ گئی۔ ماں نے کہا گائے بیچ دو ورنہ بھوکے مرجائیں گے۔ بازار میں ایک شخص نے اسے صرف تین بیج دے کر گائے لے لی اور کہا یہ بیج ایک ساتھ بوئے گا تو ایک ایسا درخت اگے گا جس کی اونچائی آسمان تک ہوگی۔ ان میں سے

دو بیج ضائع ہو گئے۔ یوسف بڑا پریشان ہوا اور اس نے بچا ہوا بیج باغیچے کی زمین میں دبا دیا۔ رات کو خوب بارش ہوئی اور صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بیج والی زمین میں ایک عجیب درخت اگا تھا جس کی جڑیں زمین پر تھیں اور تنا اور شاخیں زمین کے اندر اتر رہی تھیں۔ ماں کے منع کرنے پر بھی یوسف اس درخت پر نیچے کی طرف چڑھنے لگا۔ کافی نیچے اترنے پر وہ آوازوں کے ایک شہر میں پہنچ گیا۔ ایک سرگوشی جیسی آواز نے اسے شہر کی کہانی سنائی اور بتایا کہ یہاں تمام آوازوں کو آسمان جتنے اونچے گنبد میں قید کر لیا گیا ہے۔ مگر ان قیدی آوازوں نے وہاں سے بادشاہ کے محل تک ایک سرنگ بنائی اور اس میں فتیلہ بن کر گھس گئیں۔ یوسف کا کام تھا اس فتیلے کو آگ لگانا۔ اس نے فتیلے کو آگ دکھائی اور تیزی سے الٹے درخت پر جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں آوازوں کا شہر تباہ ہو گیا اور یوسف درخت پر نیچے چڑھنے لگا۔ تین دن تین رات چڑھنے کے بعد اندھیرے میں کسی نے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس ہاتھ نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازے کی محراب پر لکھا تھا: کالے دیو کا شہر۔ اب آگے پڑھیے:

کالے دیو کا شہر

یوسف ابھی محراب پر لکھے ہوئے حروف پڑھ ہی پایا تھا کہ کسی نے اسے پھر اپنی مٹھی میں بھر کر اٹھا لیا اور یوسف نے دیکھا، ایک بہت بڑا کالا ہاتھ ہے، ایک بہت بڑی کالی چھاتی ہے، ایک بہت بڑا کالا چہرہ ہے جس کے اندر بڑی بڑی روشن اور کالی آنکھیں ہیں۔

...آخر اس کے بڑے بڑے کالے ہونٹوں میں سے ایک گرج دار آواز نکلی اور اس نے پوچھا۔

''تو کون ہے؟''

یوسف نے پوچھا ''تو کون ہے؟''

''میں کالا دیو ہوں۔''

یوسف نے کہا '' میں ایک موچی کا لڑکا ہوں، زمین سے آیا ہوں۔''

''مگر تیرا رنگ کیسا ہے، نہ کالا ہے، نہ سفید؟''

یوسف نے کہا ''ہمارے یہاں اسے گندمی رنگ کہتے ہیں۔''

''افسوس!'' کالے دیو نے کہا ''تو میرے کسی کام کا نہیں۔ میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔ جدھر سے آیا ہے ادھر چلا جا۔''

یوسف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ دیو کیا کہہ رہا ہے۔ مگر وہ اپنی جان بچ جانے پر بڑا خوش تھا۔ اس لیے جلدی جلدی وہاں سے بھاگا۔ راستے میں یوسف نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے شہر میں سے گزر رہا ہے جہاں کے سب امیر لوگ کالے ہیں اور سب غریب لوگ سفید ہیں۔ کالے لوگ سفید لوگوں سے غلاموں کا سا کام لیتے ہیں اور انہیں بڑی گندی جھونپڑیوں میں رکھتے ہیں۔ انہیں ہتھکڑیاں پہناتے ہیں۔ انہیں چابک لگاتے ہیں۔ ان سے مزدوری کراتے ہیں۔ سب محنت کا کام سفید لوگ کرتے ہیں، اور کالے آدمی ان کی محنت پر عیش کی زندگی گذارتے ہیں۔ یوسف نے چار راتیں اور چار دن اس شہر میں بسر کیے اور ہر جگہ یہی منظر دیکھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس لیے

جانے سے پہلے وہ پھر کالے دیو کے پاس گیا اور اس سے پوچھا ''اماں کالے دیو، بھلا یہ کیا ماجرا ہے؟ ہر جگہ سفید لوگ غلام ہیں اور کالے لوگ ان پر حکومت کرتے ہیں۔''

کالا دیو ہنسا اور بولا ''جب میں نے سنا کہ تمہاری زمین پر سفید لوگ کالے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں تو مجھے بڑا غصہ آیا، اس لیے میں نے اپنی حکومت میں سفید لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہے اور کالے لوگوں کو ان پر حکومت کرنے دیتا ہوں میں نے تمہاری زمین سے پکڑ پکڑ کر سفید لوگ یہاں بلوائے ہیں اور ان کو ہتھکڑیوں میں جکڑ رکھا ہے۔''

''یہ بہت بری بات ہے۔'' یوسف نے کہا۔

''کیسے؟'' دیو نے پوچھا۔

یوسف نے کہا ''ایک سفید آدمی کو میرے سامنے لاؤ۔''

ایک سفید غلام یوسف کے سامنے لایا گیا۔

یوسف نے کہا ''اس کی انگلی کاٹو۔''

''ہاہاہا! بڑی خوشی سے۔'' دیو نے سفید آدمی کی انگلی کاٹ دی۔ اس میں سے لال لال خون بہنے لگا۔

یوسف نے کالے دیو سے کہا ''اب اپنی انگلی کاٹو۔''

کالے دیو نے اپنی انگلی کاٹی۔ اس میں سے بھی لال لال خون بہنے لگا۔

یوسف نے کہا ''دیکھو تمہاری رنگت کالی ہے، لیکن خون لال ہے۔ اس کی رنگت سفید ہے لیکن خون اس کا بھی لال ہے۔ چمڑی کی رنگت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''پھر کیا ہونا چاہیے۔'' دیو شش و پنج میں پڑ گیا۔

یوسف نے کہا ''ہونا چاہیے کہ نہ کالا سفید پر حکومت کرے اور نہ سفید کالے پر۔ دونوں مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے سے فائدے میں شریک ہوں۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔''

دیو نے سر ہلا کر کہا ''تمہاری عقل ٹھیک ہے۔ آج سے میں اپنے سفید غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ آج سے میرے شہر میں کالے اور سفید سب مل جل کر رہیں گے اور اکٹھے محنت کریں گے۔ تم بھی یہیں رہ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے شہر کا سردار بناؤں گا۔''

یوسف نے کہا ''نہیں، مجھے تو اس درخت پر چڑھنا ہے، جہاں سے تم نے مجھے اتارا تھا۔ اب اگر تم میرے حال پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو مجھے پھر اسی درخت پر پہنچا دو۔''

دیو نے یوسف کی بہت منت وسماجت کی مگر یوسف نہ مانا۔ آخر کالے دیو نے اسے اپنے ہاتھ پر اٹھا لیا اور اسے واپس درخت کی شاخ پر رکھ دیا۔

یوسف درخت پر چڑھنے لگا۔ اب اس نے دیکھا کہ بہت دور تک اندھیرا چھٹ گیا ہے اور بہت دور تک درخت کی شاخوں پر لاکھوں جگنو اوپر ہی اوپر زمین کے سینے کی طرف چمکتے چلے گئے۔ ان جگنوؤں کی مدد سے یوسف بہت دور تک درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ لیکن ایک جگہ آ کے جگنوؤں کی روشنی ختم ہو گئی اور اب کے جو اندھیرا شروع ہوا تو یوسف گھبرا ہی گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سات دن اور سات راتوں سے اسی درخت پر چڑھا رہا ہے لیکن درخت ختم ہونے میں نہیں آتا۔ یوسف گھبرا کر درخت سے واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ اسے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔

یوسف ان آنکھوں کے قریب گیا تو دیکھا کہ درخت کی ایک بڑی ڈالی پر ایک عجیب قسم کا جانور بیٹھا ہے جس کا چہرا الّو کا سا ہے لیکن باقی سب جسم آدمی کا ہے، اور اس کی آنکھوں میں سے ایک خوفناک چمک نکل رہی ہے۔

یوسف نے حیران ہوکر اس سے پوچھا ''تم آدمی ہو کہ الّو؟''

''میں ہندوستانی فلموں کا ڈائرکٹر ہوں۔'' اس عجیب مخلوق نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کے کہا۔ ''میں دن میں سوتا ہوں اور رات کو جاگتا ہوں۔''

یوسف کے گاؤں میں ایک دفعہ چلتا پھرتا سنیما آیا تھا۔ اس لیے اسے اس عجیب مخلوق کی بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

یوسف نے کہا ''مگر تم یہاں اکیلے اس درخت پر بیٹھے کیا کر رہے ہو؟''

''میں اکیلا نہیں ہوں۔'' فلم ڈائرکٹر نے جواب دیا۔ ''ذرا اس ڈال پر آگے بڑھ کر دیکھو، میرے دوسرے بھائی بند بھی جادو کے زور سے الّو بنے ہوئے یہیں بیٹھے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں۔''

اور واقعی ہی جب یوسف آگے بڑھا تو اسے ڈال پر سیکڑوں الّو نما جانور نظر آئے، جو چپ چاپ ڈال پر ٹانگیں لٹکائے اور سر جھکائے اونگھ رہے تھے۔

یوسف کو ان بے چاروں پر بڑا رحم آیا اور بولا ''تمہاری حالت ایسی کس نے کردی؟''

وہی پہلا فلم ڈائرکٹر بولا ''دس سال کے ایک بچے کے جادو کے زور سے ہم ایسے ہوئے ہیں۔''

''وہ بچہ کہتا تھا کہ ہم لوگوں نے پچھلے پچیس برس میں ایک بھی ایسی فلم نہیں بنائی جو بچوں کے لیے ہو۔ اس لیے ہمیں یہ سزا دی جاتی ہے۔''

''وہ بچہ کہاں ہے؟''

فلم ڈائرکٹر نے کہا ''اسی ڈال پر سیدھے تقریباً تین سو گز تک چلے جاؤ، آگے تمھیں روشنی نظر آئے گی۔ وہاں ایک بہت بڑا کیمرہ دکھائی دے گا۔ وہ کیمرہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے شٹر میں سے ایک آدمی گذر سکتا ہے۔ تم وہاں جا کے، کیمرے کا بٹن دبا کے تین دفعہ کہنا، کٹ کٹ کٹ۔ پھر کیمرے کا شٹر خود بخود کھل جائے گا اور تم اس کے اندر چلے جانا۔ آگے جا کے وہ بچہ تم کو خود مل جائے گا۔''

یوسف نے کہا ''مگر اس بچے کی کوئی نشانی تو بتاؤ۔''

فلم ڈائرکٹر نے کہا ''اس بچے کے دونوں ہاتھوں میں صرف ایک ایک انگوٹھا ہے، باقی سب انگلیاں کٹی ہوئیں ہیں۔''

''ایسا کیوں ہے؟'' یوسف نے پوچھا۔

فلم ڈائرکٹر نے جواب دیا ''ہمیں کیا معلوم، ہم فلم ڈائرکٹر ہیں۔ جوتشی نہیں ہیں۔''

یوسف ڈال پر آگے بڑھ گیا۔ ڈال کی آخری ٹہنی کا آخری پتہ ایک بہت بڑے کیمرے کو چھو رہا تھا۔

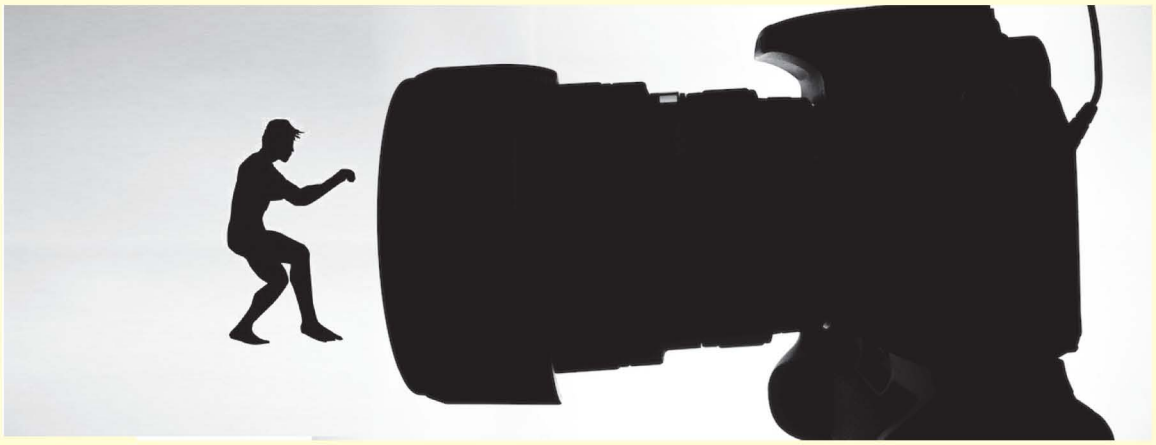

یہاں مدھم مدھم روشنی بھی تھی۔ یوسف نے کیمرے کا بٹن دبایا، کیمرے کا شیشہ دروازہ کی طرح کھل کر الگ ہوگیا۔ تھوڑی دور تک وہ اندھیرے میں چلتا رہا پھر یکا یک کہیں پر ایک کھٹکا سا ہوا اور چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہوگئی اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے شہر کے دروازے پر کھڑا ہے۔

مشینوں کا شہر

جہاں تک نظر جارہی تھی یوسف کو جگہ جگہ اونچی اونچی چمنیوں سے دھواں نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی اونچی عمارتیں تھیں۔ شہر بڑا خوب صورت اور صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ یوسف اسے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے سوچا چلو کچھ روز اسی شہر کی سیر کریں گے۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کے اندر قدم رکھا اس کے کانوں میں ایک آواز آئی ''جیب سنبھال کر چلیے جیب کتروں سے ہوشیار رہیے۔''

یوسف نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر اسے کہیں کوئی آدمی دکھائی نہ دیا جو یہ آواز دے سکتا۔ یوسف دروازے سے نکل کر آگے سڑک پر چلا گیا۔ یکا یک پھر ایک آواز آئی۔ ''فٹ پاتھ پر چلیے سرکار۔''

یوسف گھبرا کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ سڑک پر موٹریں گذرنے لگیں، بڑی خوب صورت موٹریں تھیں۔ آگے چوک پر جا کے یہ سب موٹریں رک گئیں۔ ایک لال رنگ کی بتی کے سامنے یہ موٹریں رکی پڑی تھیں۔ یوسف نے سب سے آگے کی موٹر میں جھانک کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیونکہ موٹر میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ جونہی یوسف نے موٹر میں جھانکا۔ موٹر کے اندر سے آواز آئی ''آیئے تشریف لایئے'' پھر موٹر کا دروازہ آپ ہی کھل گیا۔

یوسف اسپرنگ دار گدّوں کی سیٹ پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ موٹر میں سے پھر آواز آئی ''کہاں چلیے گا حضور؟''

یوسف نے کہا ''بازار لے چلو۔''

اتنے میں ہری بتی جلی، موٹر خود بخود روانہ ہوگئی۔ اب موٹر بازاروں میں سے گذر رہی تھی۔ بازار میں ہر دکان کھلی پڑی تھی اور

ہزاروں طرح کی چیزیں دکانوں پر نظر آرہی تھیں۔ خوب صورت کپڑے طرح طرح کے پھل اور کیک بسکٹ اور رنگا رنگ کی مہکتی ہوئی مٹھائیاں، ہر چیز سجی ہوئی تھی۔ مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ سارے بازار میں کہیں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ایک پٹرول پمپ کے پاس جا کے موٹر خود بخود رُک گئی۔ آواز آئی ''معاف کیجئے، پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ میں ذرا تھوڑا پٹرول لے لوں، آپ جب تک سامنے کی دکان دیکھیے۔''

دکان دیکھنے سے پہلے یوسف پٹرول پمپ دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ پٹرول کا نل خود بخود اٹھا اور موٹر میں پٹرول ڈالنے لگا، اور جب پٹرول ڈال چکا تو پھر خود بخود اپنی جگہ پر آ کے رک گیا۔ یوسف گھوم کے دکان کی طرف مڑ گیا۔ یہاں بڑی اچھی اچھی مٹھائیاں، تھالوں میں سجی ہوئی رکھی تھیں۔ مگر نہ کوئی دکاندار تھا نہ گاہک تھا۔ یوسف نے دو گلاب جامن اٹھائیں۔ دو رس گلے کھائے۔ ایک امرتی کھائی اور رومال سے منہ صاف کیا اور واپس چلنے کو تھا کہ کسی نے کہا ''جناب آٹھ آنے تو دیتے جائیں۔''

یوسف حیران ہو کر پیچھے مڑا مگر دکان پر کوئی آدمی نہ تھا۔ یوسف کو بڑی حیرت ہوئی۔ مگر اس نے اپنی حیرت کو دباتے ہوئے کہا۔

''میری جیب میں اس وقت تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔''

آواز آئی ''کوئی بات نہیں آپ کے حساب میں لکھ لیا جائے گا۔''

اتنے میں ایک کھٹکا ہوا اور یوسف نے دیکھا کہ دکان پر جہاں دکاندار بیٹھتا ہے وہاں ایک مشین بیٹھی ہے۔ یوسف کے جواب دیتے ہی اس مشین میں ایک بتی جلی۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز دو دفعہ آئی اور مشین سے ایک لوہے کا کمانی دار ہاتھ نکلا اس ہاتھ میں ایک چینی کی پلیٹ رکھی تھی اور اس پلیٹ پر کاغذ کے ایک پرزے پر ایک بل چھپا تھا، جس پر آٹھ آنے کی رقم درج تھی۔

آواز آئی ''اسے اپنی جیب میں رکھ لیجیے، شہر سے واپس جاتے وقت آپ سے حساب کر لیا جائے گا۔''

یوسف نے حیران ہو کر پرچہ لیا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔

موٹر نے کہا ''کہاں چلوں؟''

یوسف نے کہا ''تھک گیا ہوں، کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں آرام کر سکوں۔''

موٹر ایک عالی شان دروازے پر رک گئی۔ خود بخود موٹر کا پٹ کھلا، خود بخود ہوٹل کا دروازہ کھلا۔ یوسف اندر چلا گیا۔ اب تھوڑی تھوڑی بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف ایک بڑی مشین پڑی تھی جو اس کے آتے ہی رنگا رنگ روشنیوں سے چمکنے لگی۔ یوسف اس مشین کے پاس چلا گیا اور بولا ''مجھے ایک کمرہ چاہیے۔''

مشین نے کہا ''تمہارا نام؟''

''یوسف''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''بادشاہ کی نگری سے''

''کیسے آئے ہو؟''

''جادو کے درخت پر چڑھ کے۔''

''یہاں کتنے دن رہو گے؟''

''جتنے دن کسی انسان کی صورت نظر نہیں آئے گی۔''

مشین ہنسی۔ یوسف بھی ہنسا۔ مشین نے کہا'' یہ سامنے کا کمرہ ہے۔ اس کو لفٹ کہتے ہیں۔ اس کے اندر جا کے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ لفٹ تم کو تمھارے کمرے کے سامنے پہنچا دے گی۔''

یوسف نے ایسا ہی کیا۔ لفٹ نے اس کو ایک بہت بڑے کمرے کے سامنے اتار دیا۔ یوسف جب دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ اندر جا کے کیا دیکھتا ہے کہ ایک کمرہ ہے، بہت بڑا۔ وہ سارا طرح طرح کی مشینوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک کونے میں ایک کرسی رکھی ہے، اور اس پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور کشش ہے اور اس لڑکے کے ہاتھوں پر انگلیاں نہیں ہیں۔ صرف انگوٹھے باقی رہے ہیں۔

یوسف نے کہا''السلام علیکم''

لڑکے نے کہا''ہیلو''

یوسف نے پوچھا''تمہاری انگلیاں کہاں ہیں؟''

لڑکے نے کہا''انگلیوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہاں سب کام بٹن دبانے سے ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے انگوٹھے کافی ہے۔''

یوسف نے پوچھا'' تمہارے اس شہر کے لوگ کہاں رہتے ہیں؟ میں نے بازاروں میں، سڑکوں پر سب جگہ گھوم کے دیکھا ہے، سوائے تمہارے کسی آدمی کی صورت نظر نہیں آتی۔ اس شہر کے لوگ کہاں رہتے ہیں؟''

لڑکے نے کہا'' اس شہر میں آدمی نہیں رہتے، صرف مشینیں ہیں اور بٹن۔''

''آدمی کہاں گئے۔''یوسف نے پوچھا۔

''وہ سب مر گئے یا مار دیے گئے۔''لڑکے نے افسردگی سے کہا۔

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''یوسف نے پوچھا۔

''وہ بھی مر گئے۔ میرے والد اس شہر کے مالک تھے ان کا نام تم نے سنا ہوگا۔ موٹو رام درلا!''

''ہاں ہاں سنا تو ہے۔ ہمارے راجہ کے بہت گہرے دوست تھے۔''

''انھیں روپیہ کمانے کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے انہوں نے اس شہر میں جگہ جگہ کارخانے کھولے تھے جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ میرے پتا جی کو نئی نئی مشینیں منگانے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی کوئی مشین آتی وہ ایک کی بجائے ایک سو 100 مزدوروں کا کام کرتی۔ میرے پتا جی کارخانہ میں وہ مشین لگا لیتے اس پر کام کرنے کے لیے ایک مزدور رکھ لیتے اور باقی ننانوے مزدوروں کو نکال دیتے۔ اس طرح جوں جوں مشین بڑھتی گئیں لوگ بیکار ہوتے گئے اور بھوک سے مرنے لگے۔''

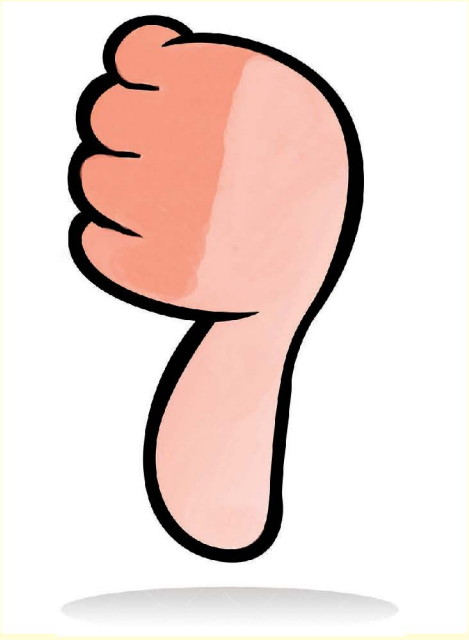

''کیوں ایسا کیوں کیا تمہارے پتا جی نے، جب ایک مشین سو مزدوروں کا کام کرتی تو تمہارے پتا جی سو مزدوروں ہی کو کام پر لگا رکھتے مگر ہر ایک سے تھوڑا کام لیتے۔ یعنی بارہ گھنٹے کی بجائے بارہ منٹ۔''

''مگر پتا جی ایسا نہیں سوچتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ میرے مزدور بارہ گھنٹے کام کرتے تھے تو اب بھی ان کو بارہ گھنٹے ہی کام کرنا چاہئے چاہے مزدور ایک رہے یا سو۔''

''مگر یہ کیوں؟ مشین آدمی کے لیے ہے۔ آدمی مشین کے لیے نہیں ہے۔ اچھی اور تیز کام کرنے والی مشین کا فائدہ آدمی کو ہی ملنا چاہئے۔ تاکہ اس کی محنت کم ہو۔ سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔''

''مگر میرے پتا جی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ مزدور کم کر دینے پر تیار تھے مگر مزدور کے کام کا وقت کم کرنے کو تیار نہ تھے۔ کہتے تھے اس سے مزدور بگڑ جائیں گے۔ مشین بگڑ جاتی ہے۔ تو اس کا پرزہ نیا ڈال دینے سے اسے ٹھیک کر لیتے ہیں۔ لیکن مزدور اگر بگڑ جائے تو پھر اسے کون سنبھالے گا؟''

''عجیب الٹی کھوپڑی کے مالک تھے تمہارے پتا جی۔''

''سنو تو۔'' لڑکے نے کہا ''ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ جب سب کام مشین کرنے لگیں، اور سب طرف بیکاری اور بھوک بڑھنے لگی تو لوگ مرنے لگے۔ مگر پتا جی بہت خوش تھے کیوں کہ ان کا نفع بڑھ رہا تھا پھر ایک دن آیا کہ قحط سے بازار کے بازار خالی ہوگئے۔ بازاروں میں سب سامان تھا۔ مگر لوگوں کے پاس خریدنے کو پیسہ نہ تھا۔ اس لیے تھوڑے دنوں میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھوک سے مر گئے۔ بہت سے لوگ بغاوت میں مارے گئے۔ جو بچے وہ شہر سے بھاگ گئے۔ ایک دن اس شہر میں صرف تین آدمی رہ گئے۔ میں اور میرے پتا جی اور میری ماتا جی۔ پھر میرے پتا جی نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ اس شہر میں اب کوئی آدمی نہ رہتا تھا۔ اس لیے اب انہیں نفع بھی نہ ہوتا تھا۔ تم جانتے ہو نفع مشینوں سے نہیں ہوتا، آدمیوں سے ہوتا ہے۔ جب کوئی آدمی ہی نہ رہا تو پتا جی کس سے نفع کماتے۔ آخر میں بے چارے میرے پتا جی اس غم کو سہار نہ سکے اور خودکشی کر کے مر گئے۔ تین سال ہوئے میری ماتا جی بھی چل بسیں۔ تب سے میں اس شہر میں اکیلا ہوں اور مشینوں کے بٹن دباتا رہتا ہوں۔ یا فرصت میں سینما دیکھتا ہوں۔ مگر کوئی تصویر بھی ایسی نہیں ملتی جو بچوں کے لیے ہو۔ اس لیے میں نے تنگ آ کر سب فلم ڈائرکٹروں کو الّو بنا کر درخت پر رکھ دیا ہے تم نے راستے میں ان کو دیکھا ہوگا؟''

''ہاں! مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری انگلیاں کس نے کاٹ ڈالیں۔''

''میرے پتا جی نے۔ بات یہ تھی کہ مجھے ہاتھ سے کام کرنے کا بڑا شوق تھا، اور وہ کہتے تھے، کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کام مشینوں کو کرنے دو۔ آدمی کو صرف بٹن دبانا چاہئے۔ اس لیے انہوں نے میری انگلیاں کاٹ ڈالیں۔'' لڑکے نے بڑی افسردگی سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ جب سب کام مشینیں کرنے لگیں، اور سب طرف بیکاری اور بھوک بڑھنے لگی تو لوگ مرنے لگے۔ مگر پتا جی بہت خوش تھے کیوں کہ ان کا نفع بڑھ رہا تھا پھر ایک دن آیا کہ قحط سے بازار کے بازار خالی ہوگئے۔

یوسف نے کہا ''تم میرے ساتھ چلو۔ اس شہر کو چھوڑ دو۔ یہ شہر نہیں ہے منافع خوروں کا قبرستان ہے۔''

لڑکے نے کہا ''تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گا؟''

یوسف نے کہا '' درخت پر چڑھیں گے۔ نئی دنیا دیکھیں گے طرح طرح کے لوگ دیکھنے میں آئیں گے۔''

لڑکے نے کہا ''مگر میں درخت پر کیسے چڑھوں گا؟ میں تو صرف بٹن دبا سکتا ہوں۔''

یوسف نے کہا '' وہ میں سکھا دوں گا۔ تم چلو تو۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''صفر صفر ایک 001''

''یہ کوئی نام ہے کیا؟ مجھے تو ٹیلی فون کا نمبر معلوم ہوتا ہے۔''

لڑکے نے کہا ''ہمارے شہر میں آدمیوں کے نام نہیں ہوتے، نمبر ہوتے ہیں۔ میرا نمبر صفر صفر ایک ہے۔''

یوسف نے کہا ''میں آج سے تمہیں موہن کہوں گا۔''

''موہن'' صفر صفر ایک نے دہراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا نام معلوم ہوتا ہے۔ موہن گھنٹی کی طرح بجتا ہے۔''

جب موہن یوسف کے ساتھ چلنے لگا تو اس نے شہر پر ایک آخری نظر ڈالی اور افسوس سے کہنے لگا۔

''مگر یہ اتنا بڑا شہر، یہ خوبصورت سڑکیں، کارخانے، کاریں، مکان، گھر، گلی کوچے، بازار، دولت کے انبار، ان سب کا کیا ہوگا؟''

''آدمی کے بغیر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ ان تمام چیزوں کی قیمت آدمی سے ہوتی ہے۔ کپڑے آدمیوں کے پہننے کے لیے ہوتے ہیں، مٹھائیاں بچوں کے کھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ سڑکیں راہگیروں کے گزرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کارخانے میں مزدوروں کے ہاتھ کام نہ کرتے ہوں اور گھروں میں عورتوں کی ہنسی نہ سنائی دیتی ہو اور گلی کوچوں میں بچوں کے شور مچانے کی آوازیں نہ آتی ہوں۔ کیا تم نے کبھی کسی گلی کوچے میں شور مچایا ہے؟''

''شور مچانا کسے کہتے ہیں؟'' موہن نے بڑی اداس نگاہوں سے یوسف کی طرف دیکھ کے کہا۔

یوسف نے اپنی بات نامکمل رہنے دی۔ اس نے موہن کو بازو سے گھسیٹ کر کہا۔

''جلدی یہاں سے بھاگ چلو ورنہ یہ خاموش شہر تمہیں کھا جائے گا۔ ابھی دس ہی سال کی عمر میں تمہارے چہرے پر جھریاں دیکھ رہا ہوں۔''

یوسف موہن کو بازو سے پکڑ کر کیمرے کی آنکھ سے باہر نکل آیا۔ باہر درخت کی ٹہنی پر فلم ڈائرکٹر بیٹھے بڑی سنجیدگی سے ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

''میں تم سے بڑا ڈائرکٹر ہوں۔''

دوسرا کہہ رہا تھا ''نہیں میں تم سے بڑا ہوں۔''

پہلے ڈائرکٹر نے کہا ''اس کا ثبوت؟''

دوسرے ڈائرکٹر نے کہا ''اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس درخت کی ٹہنی پر الٹا لٹک سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پَر پھڑ پھڑائے اور درخت کی ٹہنی سے چمگادڑ کی طرح الٹا لٹک گیا۔

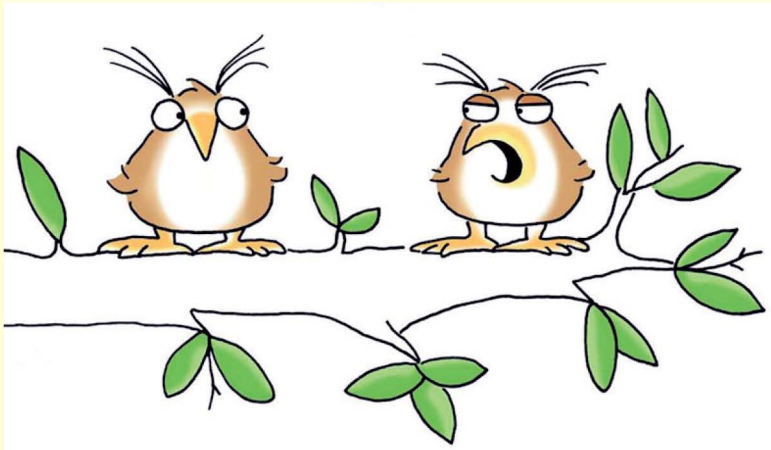

یوسف موہن کو بازو سے پکڑ کر کیمرے کی آنکھ سے باہر نکل آیا تو دیکھا کہ فلم ڈائریکٹروں میں بڑی سنجیدگی سے اس بات پر بحث بلکہ تکرار چل رہی تھی کہ ان میں بڑا فلم ڈائرکٹر کون ہے۔ دونوں اپنے اپنے دعوے کے حق میں احمقانہ دلیلیں دے رہے تھے۔

یوسف نے موہن سے کہا ''ان لوگوں کی بحث میں پڑنا ہم بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ ہم لوگ آگے چلیں۔''

پہلے ڈائرکٹر نے کہا ''میں نے تمہاری فلمیں دیکھ کر ہی معلوم کر لیا تھا کہ وہ فلمیں بھی تم نے کیمرے سے الٹا لٹک کر بنائی ہیں۔''

یوسف نے موہن سے کہا ''ان لوگوں کی بحث میں پڑنا ہم بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ ہم لوگ آگے چلیں۔'' **جاری**

یہ ہندوستان ہے پیارا

ادارہ

1

2

ہمارے تہوار: 1 ملک میں سب سے بڑے پیمانے پر منائے جانے والے ہندو بھائیوں کے تہوار دیوالی کی رات ایک بڑے مندر میں روشنی کا منظر۔ 2 'بدھ پورنیما' پر مہاتما بدھ کی مورتی کے آگے شمعیں روشن کرتے ہوئے بودھ بھکت۔ 3 پارسی بھائیوں کے مذہبی کیلینڈر کے پہلے دن 'نوروز' کے موقع پر پارسی فیملی کا ایک بچہ سلام کرتے ہوئے۔ 4 امرتسر کے گولڈن ٹمپل میں سکھ برادران وطن اپنے سب سے بڑے تہوار 'گورپرب' پر مذہبی رسم ادا کرتے ہوئے۔ 5 جین بھائی اپنے مقدس تہوار پر 'باہوبلی' کے عظیم الشان بت کے قدموں میں اپنی عقیدت ظاہر کرتے ہوئے۔

3

4

5